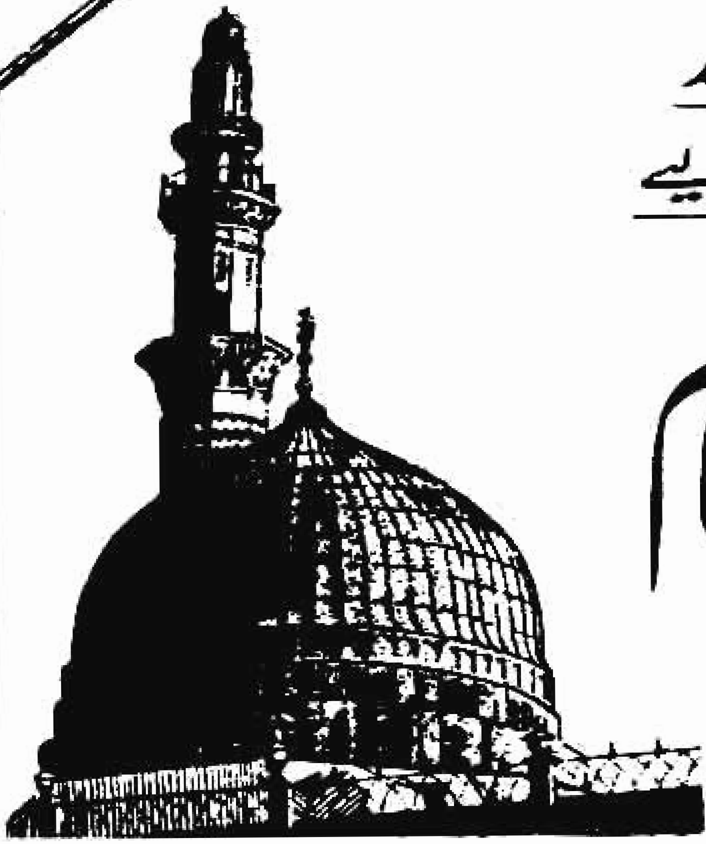
ماہنامہ

ترجمان القرآن

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ۔ لاہور (پاکستان)



جلد ۱۱۷ — اگست ۱۹۹۲ء — عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل : ۵۳۴۰

جلد ۱۱۷ | اگست ۱۹۹۲ء صفر ۱۴۱۳ھ | عدد ۶

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لیے : ماہنامہ ترجمان القرآن ۔ منصورہ ' ملتان روڈ لاہور

رابطہ و ترسیل زر کے لیے : ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۔ رحمٰن مارکیٹ ' اردو بازار ' لاہور

فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ : ۶ روپے زرسالانہ : ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

اشارات

۱۴ اگست کو ہم ایک اور یومِ آزادی منائیں گے۔ ہر ملک کو ہر وقت عام نوعیت کے مسائل اور خطرات درپیش رہتے ہیں۔ لیکن چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ کی طویل مہلتِ عمل کے بعد، آزادی کی اس سالگرہ کے موقع پر، پاکستان جن سنگین مسائل اور مہیب خطرات سے دوچار ہے، ان کی نوعیت بالکل ہی دوسری ہے۔ استحکام، سلامتی اور بقا سب داؤں پر لگے ہوئے ہیں۔ ہر چیز کے مستقبل پر، یہاں تک کہ ملک کے مستقبل پر بھی، بے یقینی کے گہرے کالے سائے چھائے ہوئے ہیں۔ کل کیا ہوگا؟ کوئی یقین کے ساتھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ لیکن کوئی سنگین سے سنگین بات بھی ایسی نہیں رہ گئی جس کا ہونا ناقابل تصور یا خارج از امکان سمجھا جاتا ہو۔ سیاسی نظام تلپٹ کیا جا سکتا ہے، امن و امان تہ و بالا ہو سکتا ہے، خون ریزی کی آگ بھڑک اٹھ سکتی ہے، فوج اور قوم باہم دست بگریباں ہو سکتے ہیں، ملک لخت لخت ہو سکتا ہے۔ ملک کی کشتی یقین کے بجائے شک، امید اور حوصلہ کے بجائے یاس و ہراس، اتحاد کے بجائے افتراق، اور دیانت و وفا کے بجائے بد دیانتی، لوٹ کھسوٹ اور بے وفائی کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔

ایسے وقت میں، جشن منانے کے بجائے خود احتسابی، اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا اعتراف، اپنی حالت میں تغیر و اصلاح کی سعی و جہد اور اپنے رب کی طرف رجوع ہی یوم آزادی منانے کا صحیح طریقہ ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ (ھود ۱۱: ۵۲)

اور اے میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔

خود احتسابی استغفار کی بنیاد ہے، اور اس کا لازمی جز بھی۔ زبان پر استغفر اللہ کے ورد کے

باوجود، پرائیویٹ زندگیوں میں بھی استغفار کا اہتمام بہت کم ہے، لیکن پبلک زندگی میں اور اجتماعی اعمال میں تو یہ بالکل عنقا ہے۔ کوئی پبلک عہدیدار نہ اپنے کسی غلط کام کی ذمہ داری قبول کرتا ہے، نہ وہ عدالت کے سامنے حاضر ہوتا ہے، نہ کبھی اسے قرار واقعی سزا ملتی ہے۔ وہ عام انسانوں پر بدترین زیادتیوں کا مرتکب ہوتا ہے ــــ بشمول بے گناہ خون، آبروریزی اور لوٹ کھسوٹ کے ــــ لیکن نہ اس سے قصاص لیا جاتا ہے، نہ اس سے رشوت اور لوٹ مار کا مال ضبط ہوتا ہے، جب کہ اسلامی قانون کے تحت دونوں سزائیں واجب ہیں۔ سزائیں تو دور رہیں، کسی کے ضمیر میں اتنی خلش بھی نہیں ہوتی جو اسے پبلک عہدوں سے مستعفی ہو جانے پر مجبور کردے۔

لیکن اس وقت ہمارے پیشِ نظر افراد کے پبلک افعال کا جائزہ بھی نہیں، کہ ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ہم اپنی توجہ پبلک لائف کے صرف ان چند اجتماعی پہلوؤں پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں، جن کا آج کے بگاڑ میں سب سے زیادہ دخل ہے۔ اور جن کی اصلاح کی فکر پوری قوم اور اس کی قیادت کو کرنا چاہیے۔

آج اگر ہر زبان پر اور ہر اخباری کالم میں مارشل لا کا ذکر ہے، ہر طرف یہ سوال ہے کہ موجودہ حکومت کب جارہی ہے، کیا مارشل لا آرہا ہے، یا کوئی نیا سیاسی نظام بننے والا ہے جس کا چہرہ سیاسی ہوگا لیکن جس کی ڈوری فوج کے ہاتھ میں ہوگی، تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اگر فوج کی طرف سے بار بار اعلانات ہوتے ہیں کہ ہم سول حکومت کے تابع ہیں اور ہماری دلچسپی ملک کے دفاع کے پیشہ ورانہ فرائض تک محدود ہے، وزیراعظم مارشل لا کے لفظ کے استعمال کو بھی ممنوع قرار دینے کے لیے کوشاں ہیں، مگر لوگوں کو یقین نہیں آتا، بلکہ سوالات اور اندیشے اور زیادہ زور پکڑتے جارہے ہیں، تو اس پر بھی انہیں تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ہماری تقریباً نصف صدی کی سیاسی تاریخ نے جو نقوش قوم کے حافظہ اور نفسیات پر مرتسم کردیے ہیں، اور ہمارے فوجی جنرلوں، سول بیوروکریٹوں اور سیاست دانوں نے جو مسلسل روایات قائم کی ہیں، وہ یہی ثابت کرتی ہیں کہ حکومتوں کا جانا اور مارشل لا کا آنا اس ملک کا معمول ہے۔ اس وجہ سے کسی وقت بھی، اور خاص طور پر آج سندھ میں فوجی آپریشن کے مسئلہ پر حکومت اور فوج کے درمیان آویزش کے حوالے سے، اس ملک میں مارشل لا کا آنا لوگوں کو عین قرینِ قیاس لگتا ہے۔ کوئی حکومت ٹھہر جائے اور اپنی مدت پوری کرلے، یہ ایک انہونی بات لگتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی کوئی نظیر ہماری تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ سوائے مسٹر بھٹو کی حکومت کے۔ لیکن وہ خود

"سول" چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی رہے' ان کے وقت میں فوج مشرقی پاکستان میں شکست کا داغ بھی اٹھائے ہوئے تھی' اور وہ وزیراعظم کا لقب اختیار کرنے کے باوجود' صدر کو بے اختیار کر کے خود ہی صدر بھی تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی مدت پوری کر لینے کی جسارت کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کی۔

اپریل ۱۹۵۳ میں خواجہ ناظم الدین کی برطرفی گورنر جنرل کے حکم سے ہوئی' اور سید مودودیؒ کے الفاظ میں "یہ تھا وہ مقام جہاں سے ہماری تاریخ کا کانٹا بدلا"... "آئین اور آئینی روایات کو توڑنے کا آغاز ہو گیا"... غلام محمد کو اتنا غیر معمولی اور دور رس غیر آئینی اقدام کرنے کی جرات کیسے ہوئی' اور وہ اس میں کیوں کامیاب ہوئے؟ اس لیے کہ کمانڈر انچیف جنرل ایوب خاں آئین کے محافظ ہونے کے بجائے گورنر جنرل کے پشتیبان تھے' سروسز آئین کے بجائے کمانڈر انچیف کی مطیع تھیں' اور قوم میں مضبوط عزم و ارادہ اتنا مفقود تھا کہ وہ آئین کی حفاظت کے لیے جنبش کرنے کو تیار نہ تھی۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ۱۹۵۳ میں جو گاڑی پٹڑی سے اتری تھی' وہ آج تک پھر پٹڑی پر واپس نہیں آسکی ہے۔ ۱۹۵۳ کی کہانی مسلسل دہرائی جاتی رہی ہے' اگرچہ کردار بدلتے رہے ہیں اور ان کے مقام بھی۔ "ایوب خاں" اگر کبھی پس پردہ اور بالواسطہ کار فرما رہے' تو کبھی عیاں اور بلاواسطہ۔ اس ریل کے اسکرین پر مسلسل چلتے رہ سکنے کے اسباب بھی تقریباً" وہی رہے ہیں جو ۱۹۵۳ میں تھے۔ اور دلائل بھی وہی دہرائے جاتے رہے ہیں' (۱۹۵۳ کا پریس نوٹ پڑھ لیں یا ۱۹۹۰ کا): ملک کی سلامتی اور استحکام' امن و امان اور نظم و نسق کی ابتری' سیاست دانوں کی نااہلی اور لوٹ کھسوٹ۔

مارشل لا آئے گا' اس پر فوراً" یقین اس لیے آجاتا ہے کہ پاکستان بیشتر مدت' براہ راست یا بالواسطہ' مارشل لا کے تحت رہا ہے۔ ۱۹۵۸ سے ۱۹۷۱ تک ایوب خاں اور یحییٰ خاں' اور ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۸ تک جنرل ضیاء الحق حکمراں رہے ہیں۔ ۱۹۵۳ سے ۱۹۹۰ تک وزرائے اعظم اس لیے برخواست ہوتے رہے کہ جنرل' صدر تھے یا صدر کے ساتھ تھے۔ ۱۹۶۲' ۱۹۷۱' ۱۹۸۵' ۱۹۸۸ میں الیکشن اس لیے نہیں ہوئے کہ یہ قوم کا حق تھا' بلکہ اس لیے ہو سکے کہ اصل حکمران قوم کو یہ "عطیہ" مرحمت کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۵۳ سے ۱۹۹۰ تک جنرلوں اور صدور کے غیر آئینی اقدامات کو عدالتوں سے سند جواز اس لیے نہیں ملتی رہی کہ یہ آئین و قانون کے مطابق تھے' بلکہ اس لیے کہ فراستِ عملی یہی کہتی تھی۔ آخر اسلحہ سے لیس قابض کو کاغذ کا ایک پروانہ کیسے بے دخل کر

سکتا تھا! ہاں، جب قابض فوت ہو گیا، تو پہلی دفعہ اس کا اقدام غیر قانونی ٹھہرا، کہ بے دخل تو اس کو قدرت کرچکی تھی۔

حکومت چلی جائے گی، یہ قیاس افواہ سے زیادہ حقیقت اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ جیسا ہم نے کہا، پاکستان کی پوری تاریخ میں، ماسوا ایک کے، کسی حکومت کے ٹھہرنے کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ صدر اور وزیراعظم کے درمیان تقسیم اقتدار کی آویزش سیاسی عدم استحکام کا ایک اہم منبع ہے۔ اس آویزش میں ہمیشہ صدر ہی کو فتح نصیب ہوئی ہے، (جو جنرل رہا ہے یا بیوروکریٹ)۔ ملک میں دستوری طور پر بھی پارلیمنٹری سسٹم بہت تھوڑے عرصہ رہا ہے (اس لیے کہ دستور ہی بہت تھوڑے عرصہ کے لیے نافذ رہا ہے)، لیکن پارلیمنٹری سسٹم کے چہرہ کے پس پردہ بھی صدر کی بالادستی قائم رہی ہے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ یہ آویزش دراصل پنجاب اور بنگال کے درمیان بالادستی کی آویزش کا شاخسانہ ہے۔ پھر بنگال کا کانٹا بھی نکل گیا، مگر یہ آویزش نہ گئی۔ معلوم ہوا کہ دراصل یہ ملٹری اور سول بیوروکریٹ اور سیاستداں کے درمیان کشمکش کا نتیجہ ہے۔ بنگال صرف اس لیے فریق بن گیا تھا کہ اس کے پاس نہتا اور بے اختیار سیاست داں ہی تھا، جنرل اور بیوروکریٹ نہ تھا۔ (جب بنگال کے پاس یہ "جنس" دستیاب ہو گئی، تو بنگلہ دیش بھی اسی آویزش کا شکار ہو گیا)۔

شیخ مجیب الرحمٰن کو اگر اسلام آباد آکر عنانِ حکومت سنبھالنے کی جرات نہ ہوئی، (جو پیش بھی نہ کی گئی)، تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ انہوں نے (تاریخی تجربات کی روشنی میں) اسی میں عافیت سمجھی۔ ورنہ آخر ان کا حشر خواجہ ناظم الدین، سہروردی، فیروزخان نون، بھٹو، جونیجو اور بے نظیر سے مختلف کیوں ہوتا۔ ان کے ایک قریبی رفیقِ کار کے کہنے کے مطابق "بائیس منہ زور گھوڑوں پر کیسے سوار ہوں؟" جنرل ضیاء الحق نے اپنی پسند کے غیر جماعتی انتخابات کرائے، ان کی خوش قسمتی تھی کہ پیپلزپارٹی نے بائیکاٹ کیا، ان کی پسند کی اسمبلی آئی، انہوں نے خود وزیراعظم نامزد کیا، لیکن ان کی گزر نہ اپنے وزیراعظم کے ساتھ ہو سکی، نہ اپنی اسمبلی کے ساتھ۔

میاں نواز شریف نے اگر وزیراعظم بنتے ہی آٹھویں ترمیم کے شکنجہ سے نکلنے کے لیے کسمسانا شروع کر دیا، اور بارھویں ترمیم جیسی بھونڈی تدبیر اختیار کی، تو یہ فطری ردِعمل تھا، مگر تھا غیر دانشمندانہ۔ ۴۰ سالہ تاریخ کو کیسے دریا برد کیا جا سکتا ہے۔ اس کشمکش میں وہ جیت نہیں سکتے، اِلاّ یہ کہ "راولپنڈی" ان کی پشت پر آجائے۔ وہ اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں تو صحیح کرتے ہیں، مگر اس سے پہلے تو وہ ایک صوبہ کے وزیراعلیٰ ہوتے ہوئے، اپنے صوبہ کی طرف

سے بھی' اور مرکزی مقتدرین کی طرف سے بھی' ملک کی وزیر اعظم کو بے دست و پا کرنے کا کارنامہ خود انجام دے چکے ہیں۔

جب تک صدر اور وزیر اعظم کے درمیان توازن صحیح خطوط پر قائم نہ ہوگا' دستوری طور پر بھی اور واقعتاً" بھی' سیاسی نظم مستحکم نہیں ہو سکتا۔ وزیر اعظم کے آتے ہی اس کا جانا ٹھہر جائے گا' اور وہ مسلسل ان افواہوں کی زد میں رہے گا کہ اب گیا' اور اب گیا۔

دستور ہونا تو ایک کاغذ کا ٹکڑا ہی ہے' لیکن روایات اور کردار کے بل پر اس کا وزن ملک میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ مجرد نظام پر سیاسی استحکام کا سارا دارومدار نہیں ہوتا' لیکن اس استحکام میں سیاسی نظام کا رول کلیدی ہے' اور سیاسی نظام میں دستور کا' خصوصاً" جہاں نہ روایات ہوں' نہ روایات کی پاس داری۔ مگر آج پاکستان میں دستور کا وزن کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں رہ گیا ہے۔ اس کو کوئی بھی طالع آزما جب چاہے' قوت کے بل پر' پھاڑ کے پھینک سکتا ہے' معطل کر سکتا ہے' یا اس میں من مانی تبدیلیاں کر سکتا ہے۔

ہمارا پہلا دستور ۹ سال میں بنا' اور دو سال ہی میں اس وقت کے صدر اور کمانڈر انچیف نے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ کا دستور قومی نمائندوں نے نہیں بنایا' بلکہ ایک فردِ واحد نے اسے قوم پر مسلط کر دیا۔ ۱۹۶۹ میں اگرچہ یہ دستور نافذ تھا' لیکن خالقِ دستور نے انتقالِ اقتدار' دستور کے مطابق نہیں بلکہ مارشل لا لگا کر کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خاں کو کیا۔ پھر اس کمانڈر انچیف نے انتخابات تو کرائے' مگر انتخابات سے پہلے اپنی مرضی سے دستور میں اتنی بنیادی اور دور رس تبدیلیاں کر دیں کہ بالکل ایک نیا دستور وجود میں آگیا۔ ون یونٹ توڑ دیا' اور مشرقی اور مغربی پاکستان میں مساوات کا اصول ختم کر دیا۔ اس طرح بار بار دستور توڑنے پھوڑنے اور مارشل لا لگاتے رہنے نے بالآخر ملک کو دو ٹکڑے کر دیا۔

۱۹۷۳ کا دستور اگرچہ مارشل لا جاری رکھنے کی دھمکی کے تحت بنا' پھر بھی اس پر بڑی حد تک اتفاق رائے ہو ہی گیا تھا۔ مگر چار سال میں مسٹر بھٹو نے پے درپے ترمیمات کرکے اس کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں کر دیں۔ پھر جنرل ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اس میں مزید ترمیمات کرکے ۱۹۷۳ کے دستور کا حلیہ ہی بدل دیا۔ ان ترامیم کو' ان ہی کی مرضی کے مطابق منتخب شدہ اسمبلی کو' ایک دفعہ پھر مارشل لا کی لٹکتی تلوار کے سائے تلے' آٹھویں ترمیمی بل کی صورت میں دستور کا حصہ بنانا پڑا۔

اس تاریخی پس منظر میں' اگر آج دستور کی بنا مشتبہ ہے' اور قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں کہ

کوئی بالکل نیا ہی سیاسی نظام آنے والا ہے' تو بالکل بجا ہے۔

پاکستان میں کوئی ہوش مند انسان یہ پیشین گوئی کرنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ یہاں مارشل لا نہیں لگے گا۔ لیکن موجودہ قومی اور بین الاقوامی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم یہ کہنے میں حرج نہیں سمجھتے کہ ہمارے نزدیک 'بوجوہ' فی الحال مارشل لا کے آنے کے کچھ زیادہ امکانات نہیں ہیں۔ پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ مارشل لا لگانے کا سوچ سکتے ہیں وہ اس بات کو بخوبی سمجھ لیں کہ آج تک مارشل لا کے بطن سے سوائے مفاسد کے اور کسی چیز نے جنم نہیں لیا ہے۔ ایوب خاں کا مارشل لا ختم ہوا تو بنگلہ دیش اور ذوالفقار علی بھٹو کے "تحفے" قوم کو دے کر گیا۔ پھر جس بھٹو کی پوری پرورش مارشل لا کے تحت ہوئی تھی' وہ جمہوریت کو بھی مارشل لا کے سانچہ میں ڈھال کر ہی چلا سکتا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا گیا' تو بے نظیر بھٹو' نواز شریف (جن کو وہ اپنی عمر بھی دے گئے ہیں)' لوٹ کھسوٹ میں مشغول عوامی نمائندے' اور سندھ میں ایم کیو ایم اور تباہ حال امن و امان کا ورثہ چھوڑ گیا۔ ملک کی سلامتی کی دہائی دے کر آنے والا مارشل لا گیا' تو ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ استحکام کے نام پر آنے والے گئے' تو آج ملک بدترین عدم استحکام اور اندیشوں کا شکار ہے۔ ملک میں اقتدار کے تینوں سرچشمے باہم دست بگریباں ہیں۔ امن و امان ہو' نظم و نسق ہو' تعلیم ہو' قومی کردار ہو' ہر طرف انحطاط اور فساد کا راج ہے۔

آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل تو کر لی' مگر ہمارے اندر قومی حیثیت سے وہ ابتدائی اوصاف بھی پیدا نہیں ہوئے جن کی بدولت کوئی قوم اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ [یہی] وجہ ہمارے لیے ماتم کا اصل مقام ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے ہاں آئین اور نظم کی اطاعت اور قانون کی حکمرانی کا بالکل ابتدائی تصور تک موجود نہیں ہے۔ ہمارے افراد کو' جن میں بڑے بڑے عالی مقام لوگ شامل ہیں کوئی ایسی تعلیم و تربیت نہیں ملی ہے جس نے ان میں کوئی قومی کیریکٹر پیدا کیا ہو۔ انہیں اپنے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ وہ بڑے مہذب (cultured) لوگ ہیں' حالانکہ تہذیب محض انگریزی بگھارنے اور انگریزوں کے سے کپڑے پہننے اور انہی کی طرح سے رہنے سہنے کا نام نہیں ہے' بلکہ آئین و قانون کی پابندی' نظم و ضبط اور اپنے حدود کو

سمجھنے اور ان سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔ اور اس اعتبار سے بیسویں صدی کی اس تیسری چوتھائی میں بھی یہ لوگ تہذیب کے اس مقام تک نہیں پہنچے ہیں جس پر اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگریزی قوم کا ایک معمولی نائی فائز تھا۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

یہ المیہ ہے ہمارے موجودہ مسائل کی اصل جڑ۔

کیریکٹر کے چند پہلو بنیادی ہیں' اور چند کا تعلق ہماری موجودہ صورت حال سے ہے جن کی فوری فکر کرنا ضروری ہے۔

جو پہلو فوری توجہ کے مستحق ہیں' ان میں سب سے اہم قومی زندگی کے بنیادی اصولوں پر اتفاقِ رائے' ان کا احترام اور ان کو تنازعات کے دائرہ سے باہر رکھنا ہے۔ ہماری نظر میں ان اصولوں میں سب سے زیادہ اہم یہ ہیں۔

(۱) اسلام کی بالاتری' اور تمام تنازعات میں اس کو حَکَم تسلیم کرنا۔ اس میں اسلام کی کوئی ایک تعبیر ماننا ضروری نہیں' بلکہ من حیث المجموع اسلام کے اس مقام کو تسلیم کرنا ہے۔

(۲) پاکستان کی سالمیت کا تحفظ

(۳) عدل و قسط کا قیام

(۴) صوبائی خود مختاری کا فی الواقع قیام

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ناقابل عبور گروہی تقسیموں یعنی **polarization** کو ختم کرکے باہمی مکالمہ' افہام و تفہیم' لو اور دو' رواداری' احترام کے ذریعہ اہم قومی مسائل پر زیادہ سے زیادہ اتفاق **(consensus)** پیدا کیا جائے' اور جہاں اختلاف ختم نہ ہو سکے اسے جمہوری ذرائع سے حل کرنے کی پابندی کی جائے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ باہمی دشنام طرازی' خصوصاً بڑے بڑے گروہوں کی حب الوطنی پر کیچڑ اچھالنے سے اجتناب کیا جائے۔ پبلک طرزِ عمل اور پالیسیوں پر شائستہ زبان و انداز میں سخت سے سخت تنقید کی جائے' مگر غیر ثابت شدہ الزامات کی بنیاد پر مطعون و متہم نہ کیا جائے۔

اگر ۳۷ فی صد ووٹ حاصل کرنے والی پیپلزپارٹی دہشت گرد اور ملک کی غدار ہے' اگر کراچی کے عوام کی بھاری اکثریت کی منتخب کردہ ایم کیو ایم بھی دہشت گرد اور ملک کو توڑنے کے لیے تیار ہے' اگر عوام کے ووٹوں سے برسراقتدار آنے والی آئی جے آئی کے حکمراں ملک کو بیچ کھا

رہے ہیں' تو ہر ہوشمند انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب یہ ملک خود کشی کا فیصلہ کر چکا ہے' اور کوئی مصلح' قوت کی کسی بھی مقدار کو استعمال کر کے 'اس کو ہلاکت اور تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ لیکن ہماری نظر میں ایسا نہیں۔ رواداری' مکالمہ اور احترام سے ان سب قومی قوتوں میں سے شری عناصر کو ممیز کر کے الگ کیا جا سکتا ہے' اگر ایسے عناصر ان میں ہیں۔ لیکن جو خود ننگے ہوں وہ دوسروں کو کپڑے کیوں کر پہنا سکتے ہیں' اور جو خود شیشے کے گھر میں ہوں وہ دوسروں پر پتھر کیوں پھینکیں۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ سیاسی اصلاح کے لیے قوت کا استعمال ختم کر دیا جائے۔ قوت سے نہ قبلہ بدلتا ہے' نہ قیادت بدلتی ہے' نہ کسی کی جگہ دلوں سے ختم ہوتی ہے۔ بلکہ الٹے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

جو پہلو بنیادی ہیں ان میں صداقت و دیانت اور عدل و انصاف کے علاوہ سب سے اہم قومی مقصد سے وابستگی' محبت اور وفاداری ہے۔ یہ قومی مقصد اسلام کے علاوہ نہ اور ہے' نہ ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر انشاء اللہ ہم آئندہ کبھی تفصیل سے لکھیں گے۔

ہدایت و ضلالت کا راز

انسان کی فطرت میں خدا نے ایک ایسی قوت رکھ دی ہے جو اس کو حق و باطل کے امتیاز اور صحیح و غلط کا فرق سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے حق کی طرف بڑھنے اور باطل سے احتراز کرنے پر مائل کرتی ہے۔ یہی قوت وہ فطری ہدایت ہے جسے خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور جس کی طرف ارشاد خداوندی فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے خلاف ایک اور قوت بھی انسان میں کام کر رہی ہے جو اس کو برائی کی طرف کھینچتی ہے، غلطی اور کج روی کی طرف مائل کرتی ہے اور جھوٹ اور باطل کو اس کے سامنے مزین کر کے پیش کرتی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بہت سی خارجی اور داخلی قوتیں ایسی ہیں جن میں سے بعض ہدایت کی قوت کو مدد پہنچانے والی ہوتی ہیں اور بعض ضلالت کی قوت کو۔ اکتساب علم اور اس کے مختلف مدارج، تربیت اور اس کی مختلف کیفیات، سوسائٹی اور اس کے مختلف احوال، یہ وہ چیزیں ہیں جو باہر سے اس پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں سے کسی ایک میں اپنا وزن ڈالتی رہتی ہیں۔ اور انسان کا اپنے اختیارِ تمیزی، اپنی فہم و فراست، اپنی عقل و بصیرت، اپنے ذرائع اکتساب علم سے صحیح یا غلط کام لینا، اور اپنی قوتِ فیصلہ کو بجا یا بے جا استعمال کرنا، یہ وہ چیز ہے جو خود اس کے ارادہ کے تابع ہے اور جس سے وہ ہدایت و ضلالت کی متضاد قوتوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی ہدایت اور اس کی مسلط کی ہوئی ضلالت دونوں غیر محسوس طور پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ ہدایت کی قوت اسے راہِ راست کی طرف لطیف اشارے کیا کرتی ہے اور ضلالت کی قوت اسے باطل کے ملمع پر رجھائے جاتی ہے۔ مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلط اثرات سے متاثر ہو کر اور خود اپنی اختیاری قوتوں کو غلط طریقے سے استعمال کر کے ضلالت کے پھندے میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ہدایت کی پکار پر کان ہی نہیں دھرتا، کبھی

ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہوتا ہے اور اس دوران میں کچھ بیرونی اثرات اور کچھ خود اس کی اپنی عقل و بصیرت، دونوں مل جل کر اسے گمراہی سے بیزار کر دیتے ہیں اور اس وقت ہدایت کی وہی روشنی جو پہلے مدھم تھی دفعتاً" تیز ہو کر اس کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت تک انسان ہدایت اور ضلالت کے درمیان مذبذب رہتا ہے، کبھی ادھر کھنچتا ہے کبھی ادھر، قوت فیصلہ اتنی قوی نہیں ہوتی کہ بالکل کسی ایک طرف کا ہو جائے۔ بعض بدقسمت اسی تذبذب کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، بعض کا آخری فیصلہ ضلالت کے حق میں ہوتا ہے، اور بعض ایک طویل کشمکش کے بعد ہدایتِ الٰہی کا اشارہ پا لیتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ خوش قسمت وہ سلیم الفطرت، صحیح القلب، اور سدید النظر لوگ ہوتے ہیں جو خدا کی دی ہوئی عقل، اس کی عطا کی ہوئی آنکھوں، اس کے بخشے ہوئے کانوں اور اس کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے ٹھیک کام لیتے ہیں۔ مشاہدات اور تجربات سے درست نتائج اخذ کرتے ہیں۔ آیاتِ الٰہی کو دیکھ کر ان سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں۔ باطل کی زینت ان کو رجھانے میں ناکام ہوتی ہے۔ جھوٹ کا فریب ان کو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتا۔ ضلالت کی کج راہیوں کو دیکھتے ہی وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آدمی کے چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر جونہی کہ وہ حق کی طرف رجوع کرتے اور اس کی طلب میں آگے بڑھتے ہیں، حق ان کے استقبال کو آتا ہے، ہدایت کا نور ان کے سامنے چمکنے لگتا ہے اور حق کو حق سمجھ لینے اور باطل کو باطل جان لینے کے بعد پھر دنیا کی کوئی قوت ان کو راہِ راست سے پھیرنے اور گمراہی کی طرف لگانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

(تفہیمات اوّل، ص ۳۱-۳۲ طبع ۱۹۷۲ء۔ لاہور)

بقیہ: رسائل و مسائل

سکا تھا۔

۳۔ مستقل امام اسی کو مقرر کرنا چاہیے جس کی داڑھی سنت کے مطابق ہو۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

۴۔ حلق کے بالوں کو مونڈا جا سکتا ہے کیونکہ وہ داڑھی کا حصہ نہیں ہیں۔

قرآن کیوں پڑھیں؟

ڈاکٹر عبدالمغنی

لفظ

انسان کی فضیلت دنیا کی دوسری مخلوقات پر جس خاص وجہ سے ہے وہ اس کا علم ہے جو سب سے پہلے خدا نے اسے عطا کیا۔ علم بنیادی طور پر چیزوں کا نام ہے۔ نام ایک لفظ ہے۔ ہر چیز، ہر کام، ہر بات کے لیے ایک لفظ ہے جو انسان بولتا، لکھتا، پڑھتا اور سنتا ہے۔ انسان کو حیوانِ ناطق بھی اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ بامعنی الفاظ بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے، یہی اس کا نطق ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے علم کا اظہار کرتا ہے۔ فہم آدمی کی خصوصیت ہے، جو اسے باشعور بناتی ہے اور غور و فکر کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہ سوچ بچار لفظوں ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ حروف کی ترکیب سے الفاظ بنتے ہیں اور الفاظ کی ترکیب سے جملے۔ چنانچہ آدمی جب سوچتا ہے تو اس کے ذہن میں لفظوں کی تصویریں بھی بنتی ہیں اور ان کی خاموش آواز بھی گونجتی ہے، پھر جب وہ چاہتا ہے تو یہی تصویر اور آواز اس کے قلم یا اس کی زبان سے نکل کر بسا اوقات دوسروں تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس طرح الفاظ کے ذریعے اظہار و ابلاغ ہوتا ہے اور سماج کے اندر افراد ایک دوسرے سے رابطہ اور مکالمہ کرتے ہیں۔ اس رابطے اور مکالمے سے ہی تہذیب پروان چڑھتی ہے، تمدن فروغ پاتا ہے۔

خدا کا لفظ

خدا نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسے علم و فہم اور نطق بھی دیا، پھر اس سے خطاب کیا اور اسے ہدایت دی۔ یہی خدا کا لفظ ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اس وحی کی مخصوص شکل وہ ہے جو خدا کی طرف سے خدا کے پیغمبروں پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور وفات تک نازل ہوتی رہی۔ یہ وحی جب سے دنیا قائم ہے ہر

زمانے اور ہر خطے میں اللہ تعالیٰ کے ہر پیغمبرؑ پر نازل ہوئی' یہاں تک کہ آخری پیغمبر کی وفات پر اس کا سلسلہ بند ہو گیا۔ انسان نے ہزاروں سال کے اندر بڑی ترقیاں کیں' روئے زمین کو آباد کیا' نکھارا اور سنوارا' کائنات کی بہت سی حقیقتیں دریافت کیں اور زندگی کا بہت سا سامان ایجاد کیا۔ اس کے ساتھ ہی مختلف علاقوں اور زمانوں میں مختلف قوموں کے درمیان متعدد زبانیں اُبھرتی اور ترقی کرتی رہیں۔ ان زبانوں میں ادبیات کے بڑے بڑے خزانے جمع ہو گئے اور وہ کتب خانوں میں محفوظ کیے گئے۔ یہ سارے خزانے الفاظ کی شکل میں فراہم ہوئے۔ ان الفاظ میں سب سے قیمتی' اصلی اور کارآمد خدا کا لفظ ہے جو مذہبی کتابوں میں پایا جاتا ہے اور یہ کتابیں انسان کو پیغمبروں کے ذریعے ملی ہیں۔ دوسری جتنی کتابیں خود انسانوں کی تصنیف کی ہوئی ہیں ان کی وہ حیثیت و اہمیت نہیں جو خدائی کتابوں کی ہے۔

خدا کا آخری لفظ

انسان کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا گیا۔ جس خدا نے اسے پیدا کیا وہ اسے مسلسل ہدایتیں بھی دیتا رہا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے ہر دَور اور ملک میں اپنے پیغمبر بھیجے' چنانچہ انسان کی پوری زندگی خدا کی مشیت کے مطابق ترقی کرتی رہی' ایک کے بعد دوسرے پیغمبر آتے رہے اور خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچاتے رہے۔ خدا کا دین جسے قرآن نے "فطرۃ اللہ" یعنی خدا کا بنایا ہوا نظامِ فطرت کہا ہے' کائنات کے اوّل روز سے ایک ہی رہا' جس کا نام قرآن کے لفظوں میں "اسلام" یعنی خدا کی بندگی و فرماں برداری ہے۔ اس ایک دین کے سوا کوئی دوسرا دین خدا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا نہ خدا کے نزدیک قابلِ قبول ہے۔ وقت اور مقام کے لحاظ سے اسی دینِ اسلام کی شریعتیں مختلف پیغمبروں کو ملتی رہیں۔ یہ "شرع" درحقیقت' جیسا عربی کے اس لفظ سے ظاہر ہے' دین پر عمل کرنے کا طریقہ و راستہ ہے۔ دین و شریعت کا دستور العمل ان کتابوں میں بروئے اظہار آتا رہا جو اللہ کے پیغمبروں پر نازل ہوتی رہیں۔ اسی لیے خدا کے پیغمبروں کو ماننے والی امتیں اہل کتاب کہلاتی ہیں۔ ان امتوں کا ایمان ان کتابوں پر ہے جو ان کے پاس آنے والے پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔

یہ سب کتابیں خدا کے الفاظ پر مشتمل ہیں۔ قرآن مجید انہی خدائی کتابوں کے سلسلے کی آخری کتاب ہے اور اس لیے خدا کا آخری لفظ ہے۔ اس لفظ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور اس میں دینِ اسلام کی وہ مکمل شریعت محفوظ ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تجویز کی گئی۔ اس شریعت کی سب سے بڑی

خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے دینِ اسلام کی تکمیل کر دی گئی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

(المائدہ-۳)

(آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔)

اس طرح قرآن مجید خدا کا آخری لفظ ہے' جس کے بعد کسی دوسرے لفظ کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا اور جس کے قبل خدا کے دوسرے جتنے الفاظ یا مذہبی کتابیں ہیں سب کی حقیقت اس آخری لفظ یا کتاب کے حوالے سے ہی معلوم کی جا سکے گی۔ موجودہ زمانے کے محاورے میں کہنا چاہیے کہ قرآن' خدا کی کتاب کا آخری ایڈیشن ہے' لہٰذا انسان کے لیے خدا کا سب سے مکمل اور مستند لفظ ہے۔

واحد محفوظ لفظِ خداوندی

قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر-۹)

(اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں)

یہ ایک تاریخی اعلان ہے' اس لیے کہ قرآن سے پہلے نازل ہونے والی اللہ کی جتنی کتابیں ہیں ان میں کوئی بھی اپنی اصلی شکل اور زبان میں محفوظ نہیں' یہاں تک کہ یہودی اور عیسائی جو اہلِ کتاب کہے جاتے ہیں ان کے پاس بھی حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی توراۃ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہونے والی انجیل کے صحیح نسخے موجود نہیں' نہ وہ اپنے پیغمبروں پر نازل ہونے والی کتابوں کی اصلیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں نہ کرتے ہیں' جب کہ قرآن کے بارے میں مسلمانوں کا ایمان ہے اور خود قرآن اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کتاب ٹھیک جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اسی طرح آج بھی موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی' یہاں تک کہ اس کی آیتوں' سورتوں اور پاروں کی ترتیب وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کرادی تھی۔ لہٰذا اب دنیا میں پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے قرآن کے سوا دوسری کوئی خدائی کتاب ایسی نہیں جس کو صحیح معنوں میں لفظِ خداوندی کہا جا سکے' خدائی کتابوں میں قرآن واحد محفوظ کتاب ہے جو اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔

آخری کتاب

آخری رسول پر نازل ہونے والی آخری کتاب کی حیثیت سے قرآن پچھلے تمام پیغمبروں پر نازل ہونے والی پچھلی تمام کتابوں کی تعلیمات کا جامع ہے' اسی لیے قرآن کا اعلان ہے کہ وہ پچھلی خدائی کتابوں کی تصدیق اور ان کی حقیقی تعلیمات کا تحفظ کرتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (المائدہ۔ ۴۸)

(پھر اے نبی' ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام پیغمبروں اور ان کو دی گئی کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ۔ ۲۸۵)

(رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ رسول کے ماننے والے ہیں انہوں نے بھی' اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں)۔

اس طرح خدا کے لفظ کو ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا جاننے کے لیے صرف قرآن کا مطالعہ کافی ہے۔ اس کتاب میں دینِ اسلام اور اس کی تمام شریعتوں کا بیان پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ موجود ہے' بلکہ خالص دین میں جو ترمیم و اضافہ پچھلی امتوں نے غلط طور پر کر دیا تھا اس کی تصریح بھی قرآن میں کر دی گئی ہے۔ چنانچہ حیات و کائنات میں حق و صداقت کے اصولوں کا مستند و معتبر اور واضح و مکمل اظہار صرف قرآن میں ہے۔

قرآن کی یہ حقیقت و اہمیت تمام کتابوں کے درمیان اس کے امتیاز' انفرادیت' عظمت اور فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ جس طرح ختم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پوری دنیائے انسانیت کے لیے آفاقی طور پر اللہ کے رسول ہیں اسی طرح ان پر نازل ہونے والی کتاب بھی تمام انسانوں کے لیے خدا کی کتاب ہے اور رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ذریعے خدائے کائنات نے رحمت کا جو پیغام ساری دنیا کو دیا ہے وہ اسی کتاب قرآن مجید میں ہے۔

قرآن کیوں پڑھیں؟

دنیا کی کتابوں میں قرآن کی تاریخی و آفاقی حیثیت ہر انسان کو اس کے مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کی تلاش ہے۔ ہر معاملے میں آدمی کے سامنے سوال یہ ہوتا ہے: کیا سچ ہے' کیا جھوٹ ہے' کیا صحیح ہے' کیا غلط' کیا حق ہے' کیا ناحق' کیا جائز اور مناسب ہے' کیا ناجائز اور نامناسب' کیا کرنا چاہیے' کیا نہیں کرنا چاہیے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس کے جواب پر زندگی کے متعلق ایک شخص کا رویہ اور دنیا میں اس کا کردار متعین ہوتا ہے۔ اگر اس سوال کا جواب غلط ہو جائے تو پوری زندگی غلط ہو جاتی ہے' چاہے کسی کو کتنی ہی دولت' کتنا ہی بڑا عہدہ اور ظاہری اقتدار و اختیار یا عیش و آرام کا سامان مل جائے۔ ایسی زندگی درحقیقت ناکام ہوتی ہے اور اس دنیا کے آگے اس کا کوئی اچھا مستقبل نہیں ہوتا' بلکہ اس کو آئندہ ہمیشہ کے لیے رسوائی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تب سوال پیدا ہوتا ہے: زندگی کے ہر معاملے میں فکر و عمل کے لیے صحیح جواب' جس پر حقیقی کامیابی اور بہتر مستقبل کا انحصار ہے' کہاں سے اور کیسے حاصل کیا جائے؟ اسی اہم ترین سوال کے جواب کے لیے قرآن کا پڑھنا اور سمجھ کر پڑھنا ضروری ہے۔ اگر قرآن نہیں پڑھیں گے تو زندگی کے کسی بھی مسئلے کا صحیح حل یقینی طور پر معلوم نہیں ہوگا' اس لیے کہ ہر چیز کا یقینی علم صرف خدا کے پاس ہے اور اس علم کا اظہار خدا کے لفظ سے ہی ہو سکتا ہے' جب کہ قرآن خدا کا آخری' واحد محفوظ' مستند اور معتبر لفظ ہے۔ قرآن کے سوا جتنے الفاظ اور ان میں بروئے اظہار آنے والے انسان کے اپنے تصنیف کیے ہوئے علوم ہیں سب کے سب قیاس' گمان اور اندازے پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "بدلتے رہتے ہیں خرد کے نظریات" آدمی اپنے ظن و تخمین سے آج کچھ طے کرتا ہے' کل کچھ اور۔ جن شہادتوں کی بنیاد پر وہ نتیجے نکالتا ہے وہ بھی بدلتی رہتی ہیں۔ ایک نسل کی دریافتیں دوسری نسل کی دریافتوں سے مختلف ہو جاتی ہیں' اس لیے کہ انسان کا علم فطری طور پر محدود اور ناقص ہے۔کسی انسان کو پورا علم نہیں دیا گیا ہے۔

سارے علم کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے' وہی علیم و خبیر ہے۔ زندگی کے تمام پوشیدہ حقائق کا علم اسی کو ہے۔ عالم الغیب اسکے سوا کوئی نہیں۔ وہ اپنے خزانۂ علم سے جب جس کو جتنا چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ اس نے سب سے زیادہ علم اپنے پیغمبروں کو دیا اور آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری کتاب قرآن مجید کے ذریعے حیات و کائنات کے تمام بنیادی امور کا علم دے دیا۔

لہٰذا ہر سوال کے جواب اور ہر مسئلے کے حل کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرنا ہی پڑے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ انسان جس کائنات میں سانس لیتا ہے وہ انسانی عقل کے لیے ایک معمہ ہے جسے خدائی ہدایت کے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا اور خدائی ہدایت نامہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں اب صرف قرآن ہے۔

شاہ کلید

متعدد مفکروں نے بجا طور پر قرآن مجید کو تمام مسائل کے حل کی شاہ کلید کہا ہے۔ دنیا کی کتابوں میں کتاب اللہ کی اصلی حیثیت یہی ہے۔ یہ عام معنوں میں کسی علم و فن کی کتاب نہیں ہے۔ اس کی تصنیف و ترتیب کا انداز وہ نہیں ہے جو انسانی کتابوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں مضامین کی فہرست اور ان کا بیان نہیں ہے۔ اس کتاب کی شان یہ ہے کہ اس میں خدا کا پیغام مکے سے مدینے تک ۲۳ سال کی مدت میں خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تحریکی زندگی کے مختلف مرحلوں اور موقعوں کے اعتبار سے مختلف مسائل کے حل کے لیے نازل ہوتا رہا۔ اس سلسلے میں فرد' سماج اور ریاست کی ہر قسم کی ضروریات کے لیے احکام دیے جاتے رہے۔ ایک بھرپور انقلابی و اصلاحی زندگی میں طرح طرح کے سوالات ابھرے اور سب کے جواب دیے گئے' یہاں تک کہ انسانیت کی ایک نئی' تازہ اور بہترین تشکیل کر دی گئی اور دنیا کے سامنے کامیاب ترین انفرادی و اجتماعی زندگی کا بہترین نمونہ ہمیشہ کے لیے پیش کر دیا گیا۔

قرآن زندگی کا ایک مکمل ضابطہ' حیات ترتیب دیتا ہے' جس میں پیدائش سے موت تک کے لیے ہدایات ہیں۔ ان ہدایات کے پس منظر میں زمین و آسمان کے تمام حقائق کے متعلق اشارات ہیں اور پیش منظر میں موت کے بعد آخرت کی زندگی کے فکر انگیز بیانات۔ اس طرح انسانیت کے سارے مسائل ایک تناظر میں' ایک تناسب اور توازن کے ساتھ جامع طور پر حل کر دیے گئے ہیں۔ قرآن بنیادی امور میں پوری زندگی اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ ہر معاملے کو طے کرنے کے لیے رہنما اصول (Guide-lines) بتا دیتا ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں اللہ کی کتاب نے انسانوں کے افکار و اعمال کی حدود متعین کر دی ہیں' تاکہ وسیع کائنات میں اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے انسان کی سمت سفر درست ہو اور واضح رہے' وہ بے سمتی کا شکار ہو کر سیدھے راستے سے بھٹک نہ جائے' تباہی کے گڑھے میں نہ گرے' تنزل کے بجائے ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ زندگی کی وسعتوں اور زمانے کی بدلتی ہوئی حالتوں کو دیکھتے ہوئے قرآن نے ہر معاملے کے آخری مسائل (Ultimate Problems) حل کر دیے ہیں یا آخری سوالات

(Ultimate Questions) کے جوابات دے دیے ہیں۔ یہ حل' یہ جواب مشکل کشا اشارات (Clues) ہیں' کنجیاں ہیں جن سے ہر مشکل کا تالا کھل جاتا ہے۔ ان معنوں میں گویا پورا قرآن ایک شاہ کلید (Master-key) ہے جس کو کسی بھی مسئلے کا قفل کھولنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ مسئلہ بالعموم کسی بھی معاملے کا آخری مسئلہ ہوتا ہے جس کا حل خدائی ہدایت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ ہدایت قرآن کی آیتوں میں مضمر ہے' جن کا مطالعہ اور فہم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ متعلقہ آیتوں کی روشنی میں حل دریافت کرے۔

چند مثالیں

قرآن حکیم میں خداوند تعالیٰ نے اپنی طرف سے کائنات و حیات کے حقائق کے انکشاف کا اعلان کیا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ (حم السجدہ - ۵۳)

(عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ ان پر بات کھل جائے گی کہ یہ فرمان واقعی برحق ہے۔)

یہ اعلان مستقبل کے صیغے میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بہت جلد حقائق انسان کے علم میں آجائیں گے اور یہ جلدی بھی وقت کے اس خدائی حساب کی بنا پر ہے جس میں طویل مدت بھی مختصر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے' جب انسانی علوم کی بہت زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی' قرآن حکیم کی متعدد آیات میں کائنات کے بعض وہ اسرار و رموز پیش کر دیے گئے جن کی اس طرح تحقیق و تصدیق اور انکشاف و اظہار کا سلسلہ آج تک جاری ہے' اگرچہ بعض حقائق تک انسان کے ذہن کی رسائی ابھی تک پورے طور پر نہیں ہو سکی ہے اور وہ صرف ظن و تخمین سے کام لے رہا ہے۔ تخلیق کائنات کا قرآنی نظریہ یہ ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ

(الانبیاء : ۳۰)

(کیا وہ لوگ جنھوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے' پھر ہم نے انھیں جدا کیا' اور پانی

سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ ہماری اس خلاقی کو نہیں مانتے؟)

سائنس ابھی تک ایک بڑے دھماکے (Big Bang) پر بحث کر رہی ہے' جس کی طرف مذکور بالا آیت میں اشارہ ہے اور تعیین کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو پھاڑ کر ایک دوسرے سے جدا کر دیا' اس کے بعد پہلی چیز جو پیدا کی گئی وہ پانی تھی اور تمام زندہ چیزیں اسی سے بنائی گئیں۔ اس بیانِ واقعہ سے تخلیقِ کائنات کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ اس طرح بطنِ مادر کے اندر انسان کی پرورش کے مراحل کا انکشاف حسبِ ذیل آیت قرآنی سے ہوتا ہے:

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ (الزمر:۶)

(وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔)

یہ پردے ہیں پیٹ' رحم اور جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بات پہلے کبھی ایک معمہ رہی ہوگی' اب طبی تحقیقات سے ایک معلوم واقعہ بن گئی ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ آسمان کی طرح زمین کے بھی متعدد طبقات ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ (الطلاق:۱۲)

(اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند)

یہ بات بھی اب زیرِ زمین علمی تحقیقات سے لوگوں کے علم میں آئی ہے' ورنہ دورِ قدیم میں ایک مدت سے صرف افلاک کی فلسفیانہ بحث ہو رہی تھی۔ دوسری اہم بات یہ کہ آیت کے الفاظ سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی قسم کی زمین دوسرے سیاروں میں بھی پائی جاتی ہے جہاں کی مخلوقات اس کی سطح پر سانس لے رہی ہیں۔ انسان کی تخلیق کا طریقہ و مرحلہ بھی قرآن نے واضح کر دیا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝

(المومنون: ۱۲۔۱۴)

(ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا'

پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ' سب کاریگروں سے اچھا کاریگر)

اس تشریح و تفصیل میں جو نکات مضمر ہیں وہ اولاً تو یہ ہیں کہ انسان کو دوسری مخلوقات سے الگ اور خاص طور پر خدا ہی نے بنایا' دوسرے یہ کہ تخلیق کے ہر مرحلے کا کاریگر خدا ہی ہے' تیسرے یہ کہ جمادات و نباتات اور حیوانات سے بالکل جدا انسان ایک "دوسری ہی مخلوق" ہے' چوتھے یہ کہ پہلی بار آدمی "مٹی کے ست" سے بنایا گیا' اس کے بعد وہ ماں کے پیٹ میں پرورش پانے لگا اور شروع سے آج تک یہ عمل باضابطہ و براہ راست خدا کے دست قدرت سے انجام پا رہا ہے۔ اس پورے بیان میں ان لوگوں کے لیے معرفت و بصیرت اور عبرت و نصیحت کا سبق ہے جو ایک خود کار مصنوعی و مادی ارتقا کے قائل ہیں۔

مذکور بالا آیات میں سائنس کے حسب ذیل شعبوں کے لیے بنیادی ہدایات اور اصول موضوعہ ہیں: علم الکائنات (Cosı ology)' علم اعضائے نسوانی (Gynaecology)' علم طبقات الارض (Geology) اور نظریہ ارتقا (Theory of Evolution)

یہ سب وہ شعبے ہیں جن میں بحث و نزاع ہوتی رہتی ہے' خاص کر نظریہ ارتقا تو بہت زیادہ متنازع فیہ ہے' اور ان بحثوں نے بے شمار علما و حکما کے ذہنوں کو مخبوط کیا ہے' جدید ترین تحقیقات اور علمی ترقیات کے باوجود متعدد امور آج تک مابہ النزاع اور تعلیم یافتہ افراد کے لیے ذہنی پریشانی کا باعث ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن کی یہ ہدایت بہت بصیرت افروز ہے کہ "الراسِخونَ فِی العِلمِ" یعنی پختہ علم رکھنے والے پیچیدہ "متشابہات" کے بجائے واضح "محکمات" پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور خدا کی طرف سے وحی کی ہوئی ہر بات پر ایمان رکھتے ہیں' اس لیے کہ غیب کی پوشیدہ باتوں کا قطعی علم صرف خدا کو ہے اور اس میں سے اتنا ہی کسی کو معلوم ہوتا ہے جتنا مشاہدہ و مطالعہ کی توفیق دے کر خدا اس پر اپنی رحمتِ خاص سے ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا علم کے ہر شعبے میں ایک پختہ کار عالم کا صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ان حقیقتوں کو جان اور مان کر تجسس و تفتیش کی راہوں میں آگے بڑھے جن کا اظہار آیاتِ قرآنی نے کر دیا ہے۔ چنانچہ قرآن سے استفادہ کا معقول و مؤثر طریقہ بھی یہی ہے کہ اس کے تمام بیانات پر پورا یقین کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے اور انہی حدود میں رہ کر غور و فکر سے کام لیا جائے جو قرآن نے مقرر کر دی ہیں۔

ضابطۂ حیات

علوم و فنون کی شاہ کلید ہونے کے علاوہ قرآن مجید کی اہمیت یہ ہے کہ یہ انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کا ضابطہ ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن نے خود لوگوں کو بار بار متوجہ کیا ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الانبیاء: ۱۰)

(لوگو ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے' کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟)

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب نازل اسی لیے ہوئی ہے کہ انسان کو اس کی حقیقت' اس کا مقصد' اس کی منزل اور اسے دنیا میں ایسی اچھی زندگی گزارنے کا طریقہ بتائے جس پر عمل کرکے وہ اپنے لیے حیاتِ جاوداں' ہمیشہ کی کامیابی اور حقیقی ترقی کا سامان کرلے۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں خاندانی رشتوں' سماجی تعلقات' معاشی معاملات اور تہذیبی اخلاقیات وغیرہ زندگی کے ہر اس پہلو کے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں جن سے انسان کو دنیا میں سابقہ درپیش ہے۔ اس میں امن کے بھی اصول ہیں اور جنگ کے بھی قوانین' جرائم کی سزائیں بھی بیان کی گئی ہیں اور لوگوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کے آداب بھی بتائے گئے ہیں۔ آدمی کے کردار کی درستگی کے لیے قرآن نے کیسے کیسے احکام دیے ہیں ان کا ایک نمونہ صرف ایک سورہ الحجرات سے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔" (آیت۔۶)

۲۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں' اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔" (آیت۔۱۱)

۳۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو۔ اور تم سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا

بقیہ بر صفحہ ۵۶

علمیات میں ایک اسلامی زاویۂ نگاہ

قرآن میں انسان کے ادراکی قویٰ کا مقام

ڈاکٹر محمد اختر سعید صدیقی

علمیات کا ایک اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان کے ادراکی قویٰ (Cognitive Powers) یا ذرائع علم (Sources of Knowledge) کی اصل نوعیت کیا ہے؟ اور یہ کہ ان قویٰ سے حاصل ہونے والی معلومات علمی طور پر کیا مرتبہ رکھتی ہیں؟ میں نے صرف انہی سوالات کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیق و تفتیش کے لیے قرآن مجید سے ایک روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

انسان کے ادراکی قویٰ کے بارے میں قرآنی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مجموعی طور پر پوری انسانی زندگی کے بارے میں قرآن کے تصورِ زندگی پر ایک سرسری نگاہ ڈال لی جائے۔ کیونکہ بہرصورت، ادراکی قویٰ کے بارے میں ہر قرآنی نقطۂ نظر لازماً قرآن کے فراہم کردہ تصورِ زندگی سے ماخوذ ہوگا، یا کم از کم اس کے منافی نہ ہوگا۔

انسانی زندگی کے بارے میں قرآن کا تصوّر

انسان اس زمین پر خدا کا نائب (خلیفہ) ہے۔ خدا نے اسے پیدا کیا۔ جاننے، سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں (سورہ السجدہ آیت ۹)۔ بھلائی اور برائی کی تمیز دی، انتخاب و ارادہ کی آزادی بخشی، تصرف کے اختیارات دیے، اور ایک طرح کی محدود خود اختیاری دے کر اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۶)۔ اس زمین پر انسان کا قیام ایک محدود وقت کے لیے ہے۔ یہ وقت اس کی مدّتِ امتحان ہے، اور اس کے بعد اسے اپنے خالق کی طرف لوٹنا ہوگا، اور اس وقت اس کے، یہاں کیے گئے، اعمال کی جانچ کرکے یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ کون امتحان میں

کامیاب ہوا اور کون ناکام۔ اس دنیا میں انسان کو صحیح راستہ دکھایا گیا ہے ' اور اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اپنی سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں استعمال کرتے ہوئے صحیح راستہ اختیار کرکے آخری حقیقی کامیابی حاصل کرلے' جو اس دنیا میں طمانیت اور اخروی زندگی میں ابدی کامیابی کا نام ہے۔ تاہم اسے یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو برعکس رویہ اختیار کرلے' جس کے نتیجہ میں اسے دنیا میں فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا' اور آخرت میں اسے ابدی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا اور اسے رنج و مصیبت کے گڑھے (جہنم) میں پھینک دیا جائے گا۔

قرآنی تصورِ زندگی کے مطابق نوعِ انسانی کے اولین افراد' جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے' بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے آگاہ تھے' زندگی کے بارے میں واضح تصور رکھتے تھے' اور ان کا طرزِ زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان صحیح زندگی سے منحرف ہو کر مختلف اقسام کے غلط رویوں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے غفلت سے' صحیح طریق کو گم بھی کیا' اور شرارت سے اسے مسخ بھی کر ڈالا۔ انہوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی و غیر انسانی اور خیالی و مادی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھہرا لیا' اور خدا کے دیے ہوئے علمِ حقیقت میں طرح طرح کے اوہام و نظریات اور فلسفوں کی آمیزش کرکے بے شمار مذاہب بنا ڈالے۔ اور یوں تہذیب و انصاف کے اصول چھوڑ کر خواہشات اور تعصبات کے زیرِ اثر ایسے قوانین گھڑ لیے جنہوں نے دنیا کو ظلم سے بھر دیا۔ انسان کو دی گئی محدود خود اختیاری کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ خدا انسان کو زبردستی صحیح راستے پر چلنے پر مجبور کرتا۔ خدا نے انسان کی محدود خود اختیاری باقی رکھتے ہوئے' انسان کی مزید ہدایت کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود انسانوں ہی میں سے بعض ایسے انسانوں کو جو خدا پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کے خواہاں تھے' اپنا نمائندہ بنایا' اور اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ ان کو علمِ حقیقت بخشا' اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتوں کو استعمال کرنے کے لیے صحیح زاویۂ نگاہ سے آگاہ کیا' اور ساتھ ہی اس کام پر مامور کیا کہ وہ بنی آدم کو اس راہِ راست پر پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔ انبیاء کی آمد کا یہ سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا' جن کی زندگی اپنی مکمل تفصیلات کے ساتھ اور جن کی ہدایت اپنی تمام جزئیات کے ساتھ' انسان کے پاس بلاکم و کاست محفوظ ہے۔

انسان کے ذرائع علم یا طرقِ علم

قرآنِ مجید کے درج بالا پیش کردہ تصورِ زندگی کا لازمی جزیہ تصور ہے کہ انسان کو اس کرۂ ارض پر اپنی مدتِ خلافت کے دوران جاننے' سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ لہٰذا منطقی طور پر اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق علم کی ماہیت و حقیقت' اور تصوّر و ذرائع کے بارے میں مباحث (discussion) کی گنجائش نکل آتی ہے۔ انسان کے اندر جاننے' سوچنے اور سمجھنے کی یہ صلاحیتیں کون سی ہیں' یا دوسرے الفاظ میں انسانی ذرائع علم یا طرقِ علم کیا ہیں؟ اس سوال کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ قرآن میں انسانی صلاحیت کے طور پر' یا انسان کی طرف نسبت کرتے ہوئے' جن ذرائع علم یا طرقِ علم کا ذکر موجود ہے ان کے لیے انیس (۱۹) مختلف الفاظ یا ان کے مشتقات کو استعمال کیا گیا ہے۔ ان الفاظ میں سمع' بصر' فواد' ذوق' لمس' قلب' تفکر' تدبر' علم' شعور' احساس' نظر' رای' فہم' تفقہ' ظن' خرص اور حکم شامل ہیں۔ یہ تمام الفاظ ان ذرائع یا طریقوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کو استعمال کرکے انسان خود اپنے بارے میں یا دوسری اشیاء کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے۔ یقیناً" بعض ایسے انسانی ذرائع بھی ہو سکتے ہیں جو ان الفاظ کے دائرے سے باہر ہوں' کیونکہ قرآن کا مقصود بہرحال تمام انسانی ذرائع واقفیت کا احاطہ کرنا نہیں معلوم ہوتا' اور شاید یہ انسان کی اپنی جاننے' سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ نت نئے ذرائع واقفیت تلاش کرے۔ تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں مذکورہ بالا تمام انسانی ذرائع علم کو یکجا کرکے اجمالاً" محض تین الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ تین الفاظ سمع' بصر اور فواد ہیں۔ مثلاً" سورہ السجدہ میں انسانی تخلیق کی ابتداء اور پھر اس کی نسل کے آغاز کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے' ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (آیت ۹) "پھر خدا نے اسے نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان' آنکھیں اور دل دیے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار بنتے ہو"۔ اسی قسم کا مفہوم سورہ مومنون کی آیت ۷۸ میں بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کی ایک اور آیت میں انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ (اسراء: ۳۶) "کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو یقیناً" آنکھ کان اور دل سب کے بارے میں انسان سے باز پرس ہونی ہے"۔

درج بالا آیات میں سمع' بصر اور فواد کے الفاظ' جن کا ترجمہ بالعموم ہمارے مفسرین آنکھ' کان

اور دل کے الفاظ سے کرتے ہیں' اپنے مفہوم کے اعتبار سے انتہائی جامع الفاظ ہیں۔ دراصل قرآن مجید میں ان الفاظ کو اصطلاحات کے طور پر استعمال کیا گیا ہے' اور ان اصطلاحات کے دائرہ میں وہ تمام ذرائع یا طرقِ علم آجاتے ہیں جن کا ذکر قرآنِ مجید میں منتشر طور پر انیس (۱۹) مختلف الفاظ یا ان کے مشتقات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک درج بالا آیات میں سمع' بصر اور فواد کی اصطلاحات محض سننے' دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیت کے معنی میں استعمال نہیں ہوئیں' بلکہ سمع سے مراد' دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت ہے' بصر سے مراد مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے' اور فواد (دل) سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کرکے مزید غور و فکر اور نئے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت ہے۔ اوپر مذکور تمام اصطلاحات کو مفہوم کے اعتبار سے ان تین اصطلاحات میں سے کسی نہ کسی کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔

انسانی ذرائع علم کی اصل نوعیت

یہ متعین کرنے کے بعد کہ سمع' بصر اور فواد قرآنی نقطۂ نگاہ کے مطابق انسان کے اہم ذرائع علم ہیں' ہم زیرِ بحث سوال کے اس حصہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ ان ذرائع علم کی اصل نوعیت کیا ہے؟ اور ان ذرائع میں سے کون سا ذریعۂ علم آخری اور اصلی حیثیت رکھتا ہے؟ نیز اس ذریعہ سے حاصل ہونے والی معلومات اور مدرکات' علمی اعتبار سے کس مرتبہ کی حامل ہیں؟ ہمارے سوال کا یہ حصہ فلسفہ میں برطانوی اور براعظمی مکاتبِ فکر کے درمیان ایک پرانی متنازعہ بحث سے مماثلت رکھتا ہے۔ ہماری مراد بیکن (Bacon)' لاک (Lock)' برکلے (Berkeley)' ہیوم (Hume)' اور مل (Mill)' کی روایتی تجربیت (classical empiricism)' اور ڈیکارٹ (Descartes)' اسپنوزا (Spinoza) اور لیبنز (Leibniz) کی روایتی عقلیت (Classical rationalism or Intellectualism) سے ہے۔ اس بحث میں اوّل الذکر مکتبِ فکر کا موقف یہ تھا کہ انسانی ذرائع علم میں اصلی اور آخری ذریعۂ علم (Ultimate Source of Knowledge) کی حیثیت صرف مشاہدہ اور تجربہ کو حاصل ہے' جبکہ ثانی الذکر مکتب اس بات پر زور دے رہا تھا کہ اصلی اور آخری ذریعۂ علم واضح اور ممیز نظریات حامل عقلی وجدان ہے۔

قرآن کی نظر میں مشاہدہ اور عقل (یعنی بصر اور فواد) دونوں انسان کے حصولِ علم میں نمایاں

کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم ان دونوں ذرائع سے کسی کا بھی کردار اس کردار سے بمشکل کوئی مماثلت رکھتا ہے جسے درج بالا مکاتبِ فکر کے قدیم علمبردار' ان ذرائع کی طرف منسوب کر کے پیش کرتے رہے ہیں۔ قرآن کی نگاہ میں ان دونوں ذرائع میں کوئی بھی ایک ایسے ذریعہء علم کی حیثیت نہیں رکھتا جسے آج تک کی تمام انسانی معلومات کا اصلی یا حتمی منبع و ماخذ قرار دیا جا سکے۔ بلکہ قرآنی نقطہ' نگاہ کے مطابق ان ذرائع میں سے کسی ایک کا حتمی اور آخری ماخذ ہونا تو درکنار' خود اس بات کی ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی کہ یہ ذرائع علم انسان کو ہمیشہ صحیح معلومات بہم پہنچائیں گے بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ وسائلِ علم اپنے طریقِ کار میں انسان کی ذاتی خواہشات تعصبات اور ماحول کے زیرِ اثر ہو کر انسان کی حقیقت کی طرف رہنمائی نہیں کرتے' اور صورتِ حال کی غلط تصویر پیش کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کہیں انسان کو ظلوم اور جہول کہتا ہے' کہیں عجلت پسند اور تھڑدلا قرار دیتا ہے' کہیں کہتا ہے' **وَاِنَّ کَثِیۡرًا لَّیُضِلُّوۡنَ بِاَہۡوَآئِہِمۡ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ** (الانعام ۱۴۰) بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ کسی علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بناء پر گمراہ کن باتیں کیے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر قرآن بعض انسانوں کے متعلق یہ تک کہہ دیتا ہے کہ **لَہُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ بِہَا ۫ وَلَہُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِہَا ۫ وَلَہُمۡ اٰذَانٌ لَّا یَسۡمَعُوۡنَ بِہَا ؕ اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ** (الاعراف ۱۷۹) "ان کے پاس دل ہیں لیکن وہ ان سے سوچتے نہیں' ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی بدتر"۔

درج بالا آیات انسان کے وسائلِ علم کا خود اس کی خواہشات' تعصبات' ماحول اور دیگر عوامل کے زیرِ اثر ہو جانے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں' اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوتا ہے کہ کوئی انسان مکمل طور پر معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہ لیا جانا چاہیے کہ قرآن' علمیاتی قنوطیت (Epistemological Pessimism) کا علمبردار ہے۔ کیونکہ علمیاتی قنوطیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ذرائع علم سے حقیقت تک رسائی کا اہل نہیں۔ یہ تصور فی الحقیقت انسان پر عدم اعتماد کا اظہار ہے' اور تاریخی طور پر انسانی محرومیت کے اعتقاد کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو خطا اور بے راہ روی سے بچانے کے لیے سخت گیر قوانین' مضبوط روایاتی بندھن اور جبار حکم وجود میں لایا جائے۔ ماضی کے مختلف ادوار میں قوموں کی غلامی میں اس اعتقاد نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن قرآن کا مطالعہ کرنے والا ایک غیر جانب دار طالب علم' قرآن میں ایسے شواہد پا لے گا جو علمیاتی قنوطیت کے برعکس علمیاتی رجائیت

(Epistemological Optimism) کی طرف رہنمائی کرتے ہے۔ انسان کا معصوم عن الخطاء ہونا قرآن کے علمیاتی رجائیت کے تصوّر سے ٹکراتا نہیں' بلکہ اسے مہمیز عطا کرتا ہے' بشرطیکہ قرآن کے زاویۂ نگاہ کو سمجھ لیا جائے' قرآن کے علمیاتی رجائیت کے تصوّر کو مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "حق اور سچائی بہت وسیع اور اپنی جگہ بیّن اور واضح ہے۔ تاہم اس پر کبھی پردہ بھی پڑ سکتا ہے۔ لیکن یہ پردے کے پیچھے سے بھی منکشف ہوتی رہتی ہے' اور اگر خود منکشف نہیں ہوتی تو ہم اپنے ذرائع علم کے دیانت دارانہ استعمال سے اسے منکشف کر سکتے ہیں۔ حقیقت پر سے پردہ اٹھانا مشکل ضرور ہوتا ہے' لیکن اس کا جب کوئی ایک حصہ بے پردہ حقیقت کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم اسے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' حق اور باطل میں تمیز کر سکتے ہیں' اور اسے پہچان سکتے ہیں کہ یہ ہی حق ہے۔

ذرا تصوّر کیجیے' اگر قرآن کو انسان کے وسائلِ علم پر اعتماد نہ ہوتا تو قرآنی تعلیمات کی حمایت میں اس استدلال کی کیا ضرورت تھی جس سے قرآن کے صفحات بھرے ہوئے ہیں' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر قرآن انسان کو آفاق و انفس میں غور و فکر کی دعوت کیوں دیتا اور کیوں کہتا سَنُرِيهِمْ اٰيَاتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حٰمٓ السجدہ ۵۳)۔ "ہم انھیں آفاق و انفس میں اپنی آیات دکھائیں گے حتیٰ کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ حق ہے۔"

بلاشبہ انسان کی نظر دھوکہ کھاتی ہے' فکر غلطی کرتی ہے' اس کی صلاحیت سمع بصر اور فواد ماحول' خواہشات اور تعصبات سے متاثر ہوتی ہے' اور اسی لیے انسانوں کے خالق نے' جو فَوْقَ كُلِّ ذِى عِلْمٍ عَلِيْمٌ (ہر صاحب علم سے زیادہ علم رکھنے والی ہستی) ہے' رسالت کا سلسلہ جاری کیا۔ رسول اور خدا کی کتاب تو وہ نور ہے جس کی روشنی میں انسان کو دیکھنے سوچنے اور سمجھنے کا صحیح زاویۂ نظر ملتا ہے۔ انبیاء انسان کو ہر قدم پر انگلی پکڑ کر چلانے کے لیے نہیں آتے' وہ انسان کی فکر و نظر کو وہ صراط مستقیم دکھاتے ہیں جس سے انسان اپنا زاویۂ نگاہ درست کرتا ہے' اور پھر اس کی فکر و نظر بہت دور دیکھنے لگتی ہے اور ساتھ ہی بہت اونچی اور بہت گہری بھی ہو جاتی ہے۔ پھر الہامی کتب اور انبیاء' انسان کی صلاحیتِ علم کو مجلّٰی اور مزکّٰی کرتے ہیں' اور انسان کو اس کی ذاتی خواہشات' تعصبات اور ماحول کے اثرات سے پاک کرکے اپنی صلاحیتِ علم کا صحیح استعمال سکھاتے ہیں یہی' تزکیۂ نفس کی حقیقت ہے۔ اس طرح قرآن کے زیرِ اثر جب صحیح زاویۂ نظر کا حامل مزکّٰی نفس اپنی سمع بصر اور فواد کی صلاحیتوں کا استعمال کرتا ہے تو غلطی کا امکان کم سے کم ہو جاتا ہے۔

قرآنِ مجید کا پیش کردہ علمیاتی رجائیت کا یہ تصوّر ہی ہے جس نے ابتدائی عہد کے مسلمانوں

کے درمیان علمی بیداری کی زبردست لہر پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ اس وقت مسلمانوں نے سمع بصر اور فواد کی قوتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ انہوں نے ان معلومات کا زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کیا جو ان کے ماضی و حال کے انسانوں سے انہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف خود اپنے مشاہدے سے انہوں نے معلوماتِ انسانی میں بے پناہ اضافہ کیا۔ تیسری طرف انہوں نے دونوں اقسام کی معلومات کو مرتب کر کے فواد کے استعمال سے نئے نتائج اخذ کیے' پرانی معلومات کی غلطیوں کو دریافت کیا' نقائص کی تکمیل کی' اور جو نئی چیزیں ان کے علم میں آتی رہیں ان سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہ علمی بیداری ہی تھی جس نے ابتدائی عہد کے مسلمانوں کو دنیا کا امام بنا دیا تھا لیکن جب اپنے دورِ عروج کے بعد ان کے زوال کا وقت آیا تو اس طرح کہ انہوں نے تھک ہار کر اپنے کیے ہوئے کام کو کافی سمجھ کر مشاہدہ سے مزید معلومات حاصل کرنے اور فواد سے اخذِ نتائج کا کام چھوڑ دیا' اور ان کا تمام سرمایۂ علمی صرف سمع سے حاصل شدہ معلومات تک محدود رہ گیا۔ اب ان کے نزدیک علم کے معنی صرف یہ رہ گئے کہ جو معلومات پہلے حاصل کی گئی تھیں اور جو نتائج اخذ کیے گئے تھے وہ کیا تھے۔ وہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ جو علم پہلے حاصل کیا جا چکا ہے وہ کافی ہے اور اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں' پہلے جو نتائج اخذ کیے جا چکے ہیں وہ صحیح ہیں اور ان میں کسی اصلاح و ترقی کی گنجائش نہیں' پہلے جتنی تعمیر ہو چکی ہے وہ مکمل ہے نہ اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے اور نہ اس سے آگے تعمیر ممکن ہے۔ اجتہاد کے دروازے بند کیے جانے کا یہی مفہوم ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس پر پہنچ کر مسلم امت دنیا کی امامت سے ہٹا دی جاتی ہے اور امامت و قیادت اس قوم کا حصہ بنتی ہے جو مزید اکتسابِ علم' مزید اخذِ نتائج اور مزید تعمیرِ حیات کا عزم لے کر آگے بڑھی۔ یہاں قرآن کے پیش کردہ ایک قانونِ قدرت کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ علم (یعنی سمع بصر و فواد کی قوتوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال) قوموں کے عروج و زوال میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ انسان اپنی صلاحیتِ اخذِ علم کی بنیاد پر دوسری مخلوقات سے افضل ہے' اور خود انسانوں کے درمیان وہ گروہ یا قوم جو علم کے مذکورہ بالا مفہوم کے اعتبار سے دوسروں سے بڑھ گئی ہو' دنیا کی امام بن جاتی ہے۔ قرآنِ مجید کی آیات ملاحظہ کیجیے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ (الزمر ۹)

ان سے پوچھو کہ کیا علم والے اور بغیر علم والے کبھی یکساں ہو سکتے ہیں۔ بے شک نصیحت تو عقل والے ہی قبول کر سکتے ہیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ ۱۱)

تم میں سے جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور جنہیں علم دیا گیا' اللہ انھیں بلند درجے عطا کرتا ہے

قرآن ہمیں علمیاتی رجائیت (Epistemological Optimisim) کا جو تصور دیتا ہے وہ بیکن اور ڈکارٹ کے پیش کردہ رجائیت کے تصور سے قطعاً" مختلف ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ انسان کو علم حاصل کرنے کے لیے' مستند سرچشمۂ علم (Authority) کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر انسان اپنے ذرائع علم آپ رکھتا ہے' اس کے پاس حواس کی طاقت ہے' جن کو وہ آثار کائنات کے محتاط مشاہدے کے لیے استعمال کر سکتا ہے اور ہر ایسے خیال و نظریہ کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے جس کا ادراک اس کی عقل اور وجدان واضح طور پر نہ کر سکے (پاپر محولہ بالا) اس کے برخلاف' قرآن کی رُو سے' انسان کے ذرائع علم حصولِ علم میں انسان کے مددگار تو ضرور ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی (Ultimate Source of Knowledge) کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان میں سے ہر ذریعہ ایک سرے تو اپنی پہنچ کے اعتبار سے محدود ہے' اور دوسری طرف خود اس انسان کی ذاتی خواہشات اور تعصبات سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے جو اسے استعمال کر رہا ہو۔ لہٰذا ان میں ایک طرف تو اس غیب کا تصور ملتا ہے جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا' اور دوسری طرف التباسِ حقیقت اور ابلیس کا تصور ملتا ہے۔ نظر آسکنے والی حقیقت بھی خواہشات اور تعصبات کے پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے' یا وہ صحیح زاویۂ نظر گم ہو جاتا ہے جس کے بغیر انسان کے ذرائع صحیح کام نہیں کر پاتے۔ لہٰذا ایک طرف تو قرآن امورِ غیب سے بعض ایسے حقائق کو خود منکشف کر دیتا ہے جو انسانی زندگی سے متعلق ہیں' اور جن کا علم عالمِ شہود میں انسان کی نظر و فکر کو صحیح زاویہ دینے کے لیے ضروری ہے۔ قرآن ان امور پر صرف اس استدلال کے ساتھ کہ ان میں کوئی چیز بھی خلافِ عقل نہیں ہے' (اگرچہ ماوراء العقل ہو سکتی ہے)' انسان کو ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ عالمِ شہود میں بھی انسان کو جامع قسم کی اصولی ہدایات دیتا ہے' جن کی حیثیت نور یا روشنی کی ہے اور جن سے انسان کا صحیح زاویۂ نظر متعین ہو جاتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں خود قرآنِ مجید کی شہادت ہے کہ

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الزمر ۲۲)

"اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے' وہ فی الحقیقت اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے' پس تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کی نصیحت کے لیے سخت ہو گئے ہیں" ۔

اسی طرح قرآن مجید کی ایک اور آیت میں کہا گیا ہے

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (ابراہیم ۱'۲)

"یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ' ان کے رب کی توفیق سے' اس خدا کے راستہ پر جو زبردست ہے' اپنی ذات میں آپ محمود ہے اور زمین و آسمان کی ساری موجودات کا مالک ہے"۔

آخر میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ایمان کے بعد اس نور کی روشنی میں جو قرآن اور خدا کے رسول کی تعلیمات سے حاصل ہوتی ہے' جب انسان عملی دنیا میں حصولِ علم کے ذرائع سمع' بصر اور فواد تینوں کا بھرپور استعمال کرتا ہے تو غلطیوں کا امکان کم سے کم ہو جاتا ہے' لیکن باقی ضرور رہتا ہے۔ غلطی کا یہ امکان بڑے کام کی چیز ہے۔ یہ غلطی کا امکان ہی ہے جو اسلاف کی فراہم کردہ معلومات پر نقد و جرح کے لیے انسان کو مہمیز کرتا ہے' اور اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ بصر اور فواد کا بھرپور استعمال کر کے پرانی معلومات کا جائزہ لے' غلطیوں کی نشاندہی کرے' نقائص کی تکمیل کرے اور نئے نتائج پیش کرے۔ علم اور سائنس کی ترقی کا سارا راز اسی غلطی کے امکان میں مضمر ہے۔ جرح و نقد' مشاہدہ و تجربہ اور اخذِ نتائج کے اس پورے عمل کو اسلامی فلسفہ کی اصطلاح میں اجتہاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اجتہاد یہی تو ہے کہ ایک شخص پورے شعور اور ایمان کے ساتھ نور' یعنی قرآن و سنت کی روشنی میں' اپنی سمع و بصر اور فواد کی قوتوں کا بھرپور استعمال کر کے کسی معاملہ میں کسی نتیجہ تک پہنچے۔ انسان کا اجتہاد صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی' لیکن کتنی پیاری بات کہی تھی خدا کے رسولؐ نے' ان پر لاکھوں درود و سلام ہوں' کہ "کل مجتہد مصیب او مخطی اذا اصاب فلہ اجر مرتین واذا اخطا فلہ اجر واحد" (ہر مجتہد اپنے فیصلے میں صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی' اگر صحیح ہو تو دگنا اجر اور اگر غلط ہو تو اس کے لیے ایک اجر ہے)۔

طبقۂ مترفین اور اسلام کا نظامِ عدل

مولانا گوہر رحمن

(۲)

معیشتِ صالحہ کے قیام اور معیشتِ فاسدہ کے انسداد کے اصول

دنیا میں آج جو معاشی اور اقتصادی نظام مروج ہیں وہ سب کے سب فاسد معیشت کے اصول پر مبنی ہیں اور دنیا کے تعلیمی اداروں میں "علم الاقتصاد" کا جو نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ اسی فاسد معیشت کو سمجھنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ یعنی جو کچھ مروج اور نافذ ہے اسے سمجھنے کے لیے' مگر جو ہونا چاہیے اور جو صحیح ہے' اس سے ان تعلیمی اداروں کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس فاسد علم الاقتصاد سے اخلاقی احکام کو بھی بالکل نکال دیا گیا ہے۔ معیشت صالحہ کے اصول و احکام اسلامی نظام معیشت کے علاوہ اور کسی نظام میں نہیں مل سکتے۔ اسلامی معیشت ہی وہ معیاری معیشت ہے جس کے ذریعے عدلِ اجتماعی اور معاشی انصاف قائم ہو سکتا ہے اور مترفین کی فاسد اور استحصالی معیشت کا انسداد ہو سکتا ہے۔ اسلامی معیشت میں حسب ذیل بنیادی اصول کارفرما ہیں۔

۱۔ کفالتِ عامہ: معاشرے کے ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی کفالت

۲۔ استحصال کا خاتمہ: ہر قسم کے معاشی ظلم و استبداد اور استحصال کا سدباب

۳۔ ارتکازِ دولت کا سدباب: ایسے احکام دیئے گئے ہیں جو وسائل کو محدود لوگوں کے پاس سمٹ آنے سے روکتے ہیں۔ ان تینوں جامع اصولوں کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ دنیوی وسائل اور معاشی ترقی "مقصدِ حیات" نہیں ہے بلکہ "ذریعۂ حیات" ہے۔

(۱) معاشی وسائل مقصدِ حیات نہیں' بلکہ ذریعۂ حیات

زندگی برائے زندگی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام نے زندگی کا ایک مقصد متعین کر دیا ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کے حصول کے لیے اللہ کی بندگی کرنا۔ لیکن چونکہ بندگی

زندگی کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کو بحال رکھنے ہی کے لیے نہیں بلکہ اس میں آسائش و راحت اور زینت و رفاہیت پیدا کرنے کے لیے بھی وسائل پیدا کیے ہیں' اور ان وسائل کو استعمال کرنے کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ اس کا حکم بھی دیا ہے۔ راہبانہ اور جوگیانہ طرزِ زندگی کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وہی ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب (البقرۃ ۲:۲۹)

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جما دیا اور اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگائیں جو ذریعہ ہے بینائی اور دانائی کا اس بندے کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہے اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا اور پھر ہم نے اس سے باغ اور کھیتی کا غلہ اور لمبی لمبی کھجور کے درخت اگائے جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے رہتے ہیں۔ (یہ سب کچھ) اپنے بندوں کو روزی دینے کے لیے پیدا کیا ہے اور ہم نے اس کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ اسی طرح ہو گا نکلنا (اس زمین سے حشر میں) (ق ۵۰ : ۷ تا ۱۱)

کہہ دو کہ کس نے حرام کی ہے تم پر اللہ کی پیدا کردہ زینت' جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور حلال و پاکیزہ رزق کو؟ (الاعراف ۷ : ۳۲)

اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور آبادی کرائی تم سے اس زمین میں (ھود ۱۰ : ۶۱)

امام جصاص ؒ نے لکھا ہے کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ زمین کا آباد کرنا واجب ہے' خواہ زراعت کی شکل میں ہو یا باغات و تعمیرات کی شکل میں ہو (احکام القرآن ج ۲' ص ۲۶۵)

غنا اور مال داری بجائے خود کوئی بری چیز بھی نہیں ہے۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہ یحبُّ الْعَبْدَ التقی الغنیّ (صحیح مسلم کتاب الزھد والرقائق)

اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند کرتا ہے جو متقی بھی ہو اور غنی بھی ہو۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ

نِعِمّاً بِالْمَال الصَّالح لِلرجل الصَّالح (مسند احمد' شرح السنۃ للبغوی)

نیک آدمی کے لیے حلال مال اللہ کی نعمت ہے۔

ان آیات و احادیث اور اس موضوع کی دوسری متعدد آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے وسائل اور ساز و سامان سے استفادہ کرنا اور دنیا کو آباد رکھنا اسلام کا حکم ہے۔ یہ کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن یہ سب کچھ ذریعۂ حیات ہے' مقصدِ حیات نہیں ہے' اور ذریعے کو مقصد

بنانا عقل و خرد کا تقاضا نہیں ہے۔

قرآن کریم میں دنیوی وسائل کو "متاعِ دنیا" کہا گیا ہے' اور امام راغب" نے لکھا ہے کہ متاع اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کچھ مدت کے لیے کچھ نہ کچھ نفع حاصل کیا جا سکتا ہو۔ اللہ تعالٰی نے سورۃ آل عمران (آیات ۱۴ تا ۱۷) میں دنیا کی خوشنما اور دل پسند چیزوں ' مثلاً عورتوں اور بیٹوں ' گھوڑوں اور مویشیوں ' سونے اور چاندی اور کھیتی کے غلوں اور پھلوں کے ذکر کے بعد فرمایا ہے' ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ' یہ سب زندگی کے وسائل ہیں اور اللہ ہی کے پاس ہے خوبصورت ٹھکانا ' اور اس کے بعد اس خوبصورت ٹھکانا یعنی جنت کا ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح اس نے آخرت کے مقابلے میں متاع دنیا کی بے حقیقتی بھی واضح کر دی ہے۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (التوبہ ۹ : ۳۸)

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا متاع قلیل ہے

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (الرعد ۱۳ : ۲۶)

اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے ایک عارضی متاع ہے

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (العنکبوت ۲۹ : ۶۴)

آخری گھر کی زندگی ہی اصل زندگی ہے

قرآنِ کریم کی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی وسائل کو مقصدِ حیات یعنی اللہ کی عبادت کا ذریعہ بنایا جائے' اللہ سے بغاوت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

(۲) کسبِ حلال

اسلامی نظامِ معیشت کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسبِ مال اور زندگی کے وسائل کی طلب میں انسان کو غیر مشروط اور غیر محدود آزادی حاصل نہیں ہے۔ نظامِ معیشت کو فاسد ہونے سے بچانے کے لیے اور انسان کی دینی و اخلاقی رفعت کے تحفظ کے لیے قرآن کریم نے یہ پابندی عائد کی ہے کہ جو کچھ بھی حاصل کرنا ہو حلال طریقوں سے حاصل کیا جائے ' اور حرام طریقوں سے اجتناب کیا جائے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری آپس میں رضا مندی سے اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو' بے

شک اللہ تم پر بے حد مہربان ہے اور جو بھی یہ کام کرے زیادتی اور ظلم سے' تو عنقریب داخل کر دیں گے ہم اس کو آگ میں اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے (النساء ۴ : ۲۹ - ۳۰)

باطل سے مراد کسبِ مال کے وہ تمام طریقے جو غیر شرعی ہوں۔ تجارت کے مفہوم میں اشیاء اور خدمات دونوں کا تبادلہ بالعوض شامل ہے۔ رضا مندی سے مراد جبری رضا مندی نہیں بلکہ قلبی رضا مندی مراد ہے' جس میں کسی نوعیت کا دباؤ' فریب اور چال بازی نہ ہو۔ "اپنے آپ کو قتل نہ کرو" کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو قتل نہ کرو' لیکن ایک دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حرام طریقوں سے مال کما کر اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کر کے اپنے اخلاق کو تباہ نہ کرو' اور اپنی آخرت خراب نہ کرو۔

اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے ان میں سے حلال طیب کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو (البقرۃ ۲ : ۱۶۸)

پس اللہ نے جو تم کو رزق دیا ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ (المائدۃ ۵ : ۸۸)

"اے رسولو! تم کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے اور نیک عمل کرو' میں تمہارے عمل کو جاننے والا ہوں (المومنون ۲۳ : ۵۱)

کسبِ حرام اور اکلِ باطل کے چند طریقے حسب ذیل ہیں:

۱- ظالم یا کافر حکمران کے ساتھ تعاون کرنے کے بدلے میں دولت کمانا اور جاگیریں بنانا۔

۲- ربوٰ یعنی قرض پر نفع حاصل کرنا جسے مشروط کر دیا گیا ہو۔

۳- مخاطرہ' یعنی جوے کی تمام شکلیں۔

۴- رشوت کی تمام شکلیں بشمول ان تحفوں کے جو عمال کو سرکاری ڈیوٹی کے دوران دیے گئے ہوں۔

۵- چوری' ڈکیتی' غصب اور شرعی وارثوں کا حق نہ دینا۔

۶- غش' یعنی دھوکہ دینا اور خراب چیز کو اعلیٰ چیز کی قیمت پر فروخت کرنا۔

۷- محرمات اور فواحش و منکرات کا کاروبار کرنا۔

۸- غبنِ فاحش' یعنی مروجہ اور متعارف قیمتوں سے زیادہ قیمتیں وصول کرنا۔

۹- تلقی جلب' یعنی تجارتی مال تاجروں سے راستے ہی میں سستے داموں خرید کر مارکیٹ میں مہنگے داموں فروخت کرنا۔

۱۰ - احتکار ' یعنی ذخیرہ اندوزی کے ذریعے مصنوعی قلت پیدا کر کے اشیاء ضرورت کی من مانی قیمتیں وصول کرنا۔

۱۱ - استحصال ' یعنی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت و خدمت کو یا اس کی کسی چیز کو مروجہ قیمت سے کم پر حاصل کرنا۔

۱۲ - اجارہ داری ' یعنی صنعتوں ' تجارتی اداروں اور دوسرے معاشی وسائل پر مخصوص افراد کا کنٹرول -

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں ورنہ حدیث و فقہ کی کتابوں میں بیوعِ فاسدہ کی اور بھی کئی مثالیں دی گئی ہیں اور سب کا انسداد ضروری ہے۔ غیر شرعی کاروبار کے سد باب کے لیے فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ؐ نے سعید بن سعید بن عاصؓ کو مکہ کے بازار کا نگران (محتسب) مقرر فرمایا تھا اور مدینہ کے بازاروں کی نگرانی ایک وقت میں حضرت عمرؓ کے سپرد کی تھی۔

(۳) ناجائز دولت اور غیر شرعی جاگیروں کی ضبطی

اسلامی معیشت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ حرام دولت اور غیر شرعی جائیدادوں اور جاگیروں یا کارخانوں کو ضبط کر لیا جائے - اس کی اصولی دلیل تو یہ ہے کہ کسبِ حرام ایک منکر ہے جس کا مٹانا حکومت کا فرضِ منصبی ہے اور مٹانے کا طریقہ یہی ہے کہ اول تو کسبِ حرام کے تمام راستے بند کر دیے جائیں' لیکن اگر ' تمام انسدادی تدابیر کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے چور دروازوں کے ذریعے حرام دولت جمع کر لی ہو ' یا ان تدابیر کے نفاذ سے پہلے (مگر نزولِ حرمت کے بعد) کسی نے ناجائز دولت اکٹھی کر لی ہو' تو اسے ضبط کر لیا جائے تاکہ کوئی دوسرا کسبِ حرام کی جرات نہ کر سکے - فقہا نے لکھا ہے کہ اگر قاضی یا کسی دوسرے افسر نے لوگوں سے تحفے وصول کیے ہوں تو یہ سارے تحفے بحق بیت المال ضبط کر لیے جائیں گے۔ بعض فقہا کے نزدیک دینے والوں کو واپس دلائے جائیں گے' اور اگر واپس دلانا مشکل ہو تو پھر بیت المال میں جمع کر دیے جائیں گے (فتح القدیر' ادب القاضی)

تحفے کھلی رشوت نہیں ہیں بلکہ صرف شبہ ہے کہ رشوت میں دیے گئے ہوں گے۔ جب یہ مشتبہ مال ضبط کیا جا سکتا ہے تو کھلی اور حقیقی رشوت میں حاصل کردہ دولت اور جاگیر کیوں ضبط نہیں کی جا سکتی - فقہاؒ کے اس فتوے کی دلیل درج ذیل حدیث ہے'

ابو حمید ساعدیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے بنو اسد (ازد) کے ایک شخص کو'

جس کا نام "ابن اللتبیہ" تھا' صدقات وصول کرنے کے لیے عامل مقرر فرمایا تھا اس نے آکر کہا کہ یہ مال تو آپ کا ہے (بیت المال کا) ' اور یہ مجھے تحفے میں دیا گیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کیا ہو گیا ہے اس کارندے کو جسے ہم اپنے کام پر (سرکاری کام پر) بھیجتے ہیں' اور وہ کہتا ہے کہ یہ مال تمہارا ہے اور یہ میرا ہے۔ یہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں کیوں نہیں بیٹھا رہتا تاکہ دیکھتا کہ اسے تحفہ ملتا ہے یا نہیں ملتا؟

بلاذری ؒ نے لکھا ہے ' عبد اللہ بن مبارک ؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ تقرری کے وقت اپنے عمال کے اموال کی مقدار لکھ لیا کرتے تھے۔ پھر اگر ان کی جائیداد اور مال اس مال سے اور تنخواہ میں لیے گئے مال کی مجموعی مقدار سے زیادہ ہو جاتا تو اس زائد مال کا آدھا حصہ ضبط کر لیا کرتے تھے۔ بلاذری ؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ جب مصر کے حاکم تھے تو ان کی دولت بھی کچھ بڑھ گئی تھی حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہؓ کو تحقیقات اور آڈٹ کے لیے بھیجا۔ انھوں ؒ نے حساب کرنے کے بعد عمرو بن العاصؓ کی دولت کا آدھا حصہ ضبط کر لیا (فتوح البلدان)

امام ابو عبید قاسم بن سلام ؒ (م ۲۲۴ھ) نے لکھا ہے کہ

حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ بعض گورنروں کی دولت میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک شخص عمرو بن الصعق نے یہ صورت حال حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجی۔ حضرت عمرؓ نے ان افسروں کے پاس' جن میں حضرت سعدؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ بھی شامل تھے' ایک آڈیٹر بھیجا ' اس نے ان کی دولت کا نصف حصہ لے لیا۔ (کتاب الاموال)

عدل فاروقی کا ایک اور درخشاں فیصلہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ فیصلہ مشہور اور قدیم محدث عبد الرزاق بن ہمام (م ۲۱۱ھ) نے اس طرح نقل کیا ہے '

محمد بن سیرین ؒ تابعی سے مروی ہے کہ ابو ہریرہؓ جب بحرین سے واپس آئے ' تو حضرت عمرؓ نے فرمایا ' اے اللہ اور اس کی کتاب کے دشمن ! کیا تم نے اللہ کا مال چرا لیا ہے ؟ ابو ہریرہؓ نے کہا ' میں نہ اللہ کا دشمن ہوں اور نہ اس کی کتاب کا بلکہ میں تو اس کا دشمن ہوں جو ان دونوں سے دشمنی کرتا ہو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا پھر یہ دس ہزار کی رقم تمہارے پاس کہاں سے آگئی ؟ ابو ہریرہؓ نے جواب دیا کہ میرے گھوڑوں کی نسل بڑھتی رہی ' میری تنخواہ مجھے ملتی رہی ' اور میرے حصے (غنیمت وغیرہ کے) مجھے پہنچتے رہے۔ لیکن باوجود اس جواب کے حضرت عمرؓ نے وہ رقم ان سے لے لی۔ ابو ہریرہؓ

فرماتے ہیں کہ میں نے جب صبح کی نماز پڑھی تو امیر المومنین کے لیے دعائے مغفرت کی۔

(مصنف عبد الرزاق 'کتاب الاموال لابی عبید)

حضرت عمرؓ کے ہم نام اور ان کی پوتی کے بیٹے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے اقدامات بھی ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ یہ اگرچہ تابعی تھے صحابیؓ نہیں تھے 'مگر ان کی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ ان کا خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد پہلا اقدام یہ تھا'

جب عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے اپنے خاندان اور اپنے گھرانے سے اصلاحات کا آغاز کیا اور ان کے قبضے میں جو جائیدادیں تھیں ان کو مظالم قرار دے کر ضبط کر لیا --- (حلیتہ الاولیاء از ابو نعیم اصفہانی' تاریخ الاسلام از ذہبی)

حضرت عمر بن خطابؓ اور عمر بن عبد العزیزؒ کی ان تابندہ اور درخشندہ مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاشی مظالم کے خاتمے کے لیے نہ صرف یہ کہ حرام مال ضبط کرنا ضروری ہے' بلکہ مشتبہ اور مشکوک مال کا کچھ حصہ بھی ضبط کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ابوہریرہؓ' عمرو بن عاصؓ' سعدؓ اور بعض دوسرے صحابہ کے اموال کا آدھا حصہ جو ضبط کیا تھا یہ صرف شبہ اور عدم اطمینان کی بنا پر ضبط کیا تھا' ورنہ ان صحابہؓ نے آڈٹ کے وقت جو جوابات دیے تھے وہ بظاہر صحیح معلوم ہوتے ہیں' اور صحابہؓ پر ہم یہ بدگمانی بھی نہیں کر سکتے کہ انہوں نے قومی خزانے میں خرد برد کیا ہو گا۔ ان کے ایمان کامل ہونے کی گواہی تو خود اللہ نے دی ہے لیکن عدلِ فاروقی اور جلالِ عمری نے شبہ کی بنیاد پر ان کے اموال ضبط کر لیے تاکہ امت کے لیے نمونہ رہے۔

ناجائز طریقوں پر حاصل کردہ اموال جب ضبط کر لیے جائیں تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ اصل مالکوں کو پہنچا دیے جائیں گے' اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر نادار مستحقین میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ انہی دلائل کی بنا پر فقہا نے لکھا ہے کہ مال مغصوبہ اور اس سے حاصل کردہ نفع اگر مالک کو نہ دیا جا سکتا ہو تو غاصب سے لے کر مستحقین کو دے دیا جائے گا (ہدایہ 'کتاب الغصب)

(جاری ہے)

اک چراغ اور بجھا

حافظ محمد ادریس

قارئینِ ترجمان کے لیے مولانا چراغ دین مرحوم و مغفور کا نام ہرگز اجنبی نہیں ہے۔ وہ مدت مدید تک ترجمان القرآن کے مینیجر رہے۔وہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ کے معتمد ساتھی اور رفیق تھے۔ حافظ محمد ادریس صاحب امیر جماعتِ اسلامی صوبہ پنجاب نے مولانا چراغ دین مرحوم پر یہ مضمون خصوصی طور پر ترجمان کے لیے تحریر کیا ہے۔

(ادارہ)

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اس صدی کے عظیم انسان، مفکرِ اسلام اور مجددِ امت تھے۔ انھوں نے اپنی تحریکِ تجدید و احیائے دین کا کام سخت کٹھن اور نا مساعد حالات میں شروع کیا۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک اور انتہائی محنتی انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں پر کشش شخصیت اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے خوب نوازا تھا۔ مخلص ساتھی برصغیر کے چپے چپے سے ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان ساتھیوں کے درمیان عمر، علم، زبان، نسل اور علاقے کے لحاظ سے ہر طرح کے لوگ پائے جاتے تھے۔ مولاناؒ کے ابتدائی ساتھیوں میں سے چند ایک ہی اب باقی رہ گئے ہیں۔ جو باقی ہیں وہ آہستہ آہستہ اٹھتے جا رہے ہیں۔ جب بھی کوئی موتی تسبیح سے گرتا ہے، سید مودودیؒ کی یادیں دلوں کو تڑپا جاتی ہیں۔

سید مودودیؒ کے ابتدائی رفقا میں چوہدری چراغ دین بھی شامل تھے۔ چراغ دین صاحب بلا شبہ ایک چراغ کی مانند زندہ رہے اور دین کی روشنی لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ وہ سورج تو نہ تھے کہ پوری دنیا ان کے نام سے واقف ہو جاتی یا ان کی روشنی سے نور پاتی البتہ وہ چراغ کی طرح اپنے قرب و جوار کے ماحول کو ہمیشہ منوّر کرتے رہے۔

ذوالحجہ کا چاند طلوع ہوا تو یہ چراغ گل ہو گیا۔ ۳ جون ۱۹۹۲ء کی شام وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ۴ جون کو صبح ۹ بجے امیرِ جماعتِ اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد صاحب نے مرحوم کی نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز میں دیگر لا تعداد احباب کے علاوہ محترم میاں طفیل محمد صاحب سابق امیرِ جماعت بھی شریک تھے۔ میاں صاحب نہایت غمزدہ تھے اور بار بار فرما رہے تھے "دارالاسلام میں مولانا مودودیؒ کے اولین ساتھیوں میں چراغ دین صاحب کا پہلا نمبر تھا۔ وہ مولانا مرحوم کے قدیم ترین ساتھی تھے۔

مولاناؒ کے ساتھی ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ محفل سونی ہوتی جا رہی ہے۔ انسان گھٹ رہے ہیں، سائے بڑھ رہے ہیں۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

مولانا چراغ دین مرحوم عظیم انسان تھے۔ عظیم لوگوں کی طرح زندہ رہے اور اللہ کے مقرب بندوں کی طرح دنیا سے آخرت کو سدھارے۔ مرحوم کا یہ معمول تھا کہ نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کے بعد بلا ناغہ تلاوتِ قرآن مجید فرماتے تھے۔ ۳ جون کو حسبِ معمول تلاوت فرمائی اور اگلی دنیا کو اسی وقت کوچ کر گئے۔ مرحوم کے بیٹے ضیاء الدین صاحب نے بتایا کہ ۳ جون کو نماز عصر مسجد میں ادا کر کے گھر لوٹے مگر نمازِ مغرب کے وقت فرمانے لگے "میں کچھ کمزوری محسوس کر رہا ہوں، نماز گھر میں ہی ادا کروں گا۔" چنانچہ وہ پہلی نماز تھی جو گھر پر تنہا ادا کی اور وہی آخری نماز تھی جو حیاتِ مستعار میں انھیں ادا کرنا تھی۔

نماز مغرب کے بعد حسبِ معمول تلاوت کے لیے قرآن پاک ہاتھ میں لیا مگر تلاوت کے دوران میں ہی دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ دورہ پڑنے کے بعد جب تک سانس کا سلسلہ جاری رہا مسلسل کلمہ طیبہ اور ذکرِ الٰہی کا ورد کرتے رہے۔ یہ موت کتنی قابل رشک ہے! نہ کسی پر بوجھ بنے، نہ ایک بھی نماز قضا ہوئی۔ مغرب ادا کر چکے تھے، عشاء سے پہلے کوچ کر گئے!

مولانا چراغ دین صاحب کو چوہدری بھی کہا جاتا تھا اور میاں بھی۔ وہ نہایت مخلص، انتہائی کشادہ دل، حد درجہ سادہ اور بے پناہ درد دل رکھنے والے ساتھی تھے۔ میں چراغ دین صاحب کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میں نے سن شعور کے بالکل آغاز میں رسالہ ترجمان القرآن دیکھا تھا۔ میرے نزدیک طویل عرصے تک مولانا چراغ دین اور رسالہ ترجمان آپس میں لازم و ملزوم تھے۔ ترجمان کا ذکر آتا تو تلازمِ خیالات کا سلسلہ فوراً چراغ دین صاحب تک جا پہنچتا اور اگر

مرحوم کا نام لیا جاتا تو فوراً رسالے کی جانب توجہ مبذول ہو جاتی تھی۔

چراغ دین صاحب کی تعلیم میٹرک تک تھی۔ وہ محکمہ ڈاک میں ملازم تھے مگر جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے پیغام اور دعوت سے متعارف ہوئے تو ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ قافلہ سخت جاں میں شامل ہو گئے۔ اور زندگی بھر اس سنگلاخ وادی میں آبلہ پا رہے۔ دارالاسلام کے قیام کے دوران ہی میں وہ رسالہ ترجمان القرآن کے مینجر مقرر ہوئے اور غالباً ۱۹۷۸ء تک یہ ذمہ داری بحسن و خوبی ادا کرتے رہے۔ مولانا مرحوم کی زندگی کے آخری سالوں میں حسین فاروق مودودی صاحب نے چراغ دین صاحب کو ترجمان کی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد مرحوم نے کچھ عرصہ حفیظ الرحمان احسن صاحب کے قائم کردہ ادارے الابلاغ میں بھی کام کیا مگر گذشتہ چند سالوں سے اپنی صحت کی کمزوری اور بڑھاپے کی وجہ سے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

میں نے بچپن میں مولانا چراغ دین صاحب کا نام یوں سنا تھا کہ ادارہ ترجمان کے مینجر کی حیثیت سے وہ ترجمان کے خریداروں کو وقتاً فوقتاً خط لکھتے رہتے تھے۔ ایسے خطوط ہمارے ہاں بھی آتے تھے۔ رسالہ ترجمان میرے تایا مرحوم کے نام آتا تھا مگر اس کا چندہ میرے والد محترم ادا کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تایا مرحوم مقامی حلقہ متفقین کے ناظم اور والد محترم بیت المال کے ناظم ہوا کرتے تھے۔ اور میرے ایک رشتے کے چچا کا نام بھی چراغ دین تھا۔ وہ ہفتے میں کم از کم ایک دن ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ ان کا گاؤں ہمارے گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے یہ چچا بہت خوب صورت اور تیکھے ناک نقشے کے مالک تھے' اس لیے ساتھ ہی بذلہ سنج اور ظریف الطبع! میں نے مولانا چراغ دین صاحب کے بارے میں جو تصوراتی نقشہ ذہن میں بٹھایا وہ اپنے مرحوم چچا کی مناسبت سے تھا۔ بہت عرصہ بعد جب مولانا چراغ دین صاحب کو دیکھا تو ان کے ناک نقشے کو اپنے چچا سے بالکل مختلف پایا۔ البتہ ان کے اخلاص' محبت' اپنائیت اور دائمی مسکراہٹ نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔

مولانا مودودی مرحوم و مغفور سے جب بھی ملنے کا اتفاق ہوتا' چراغ دین صاحب ان کی مجلس میں موجود ہوتے تھے۔ وہ بھاری بھرکم جسم کے مالک تھے اور ہونٹ' ناک' گال ہر چیز موٹی تھی مگر دل بڑا لطیف اور مزاج بڑا نفیس تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان سے مل کر مجھے ہمیشہ مسرت ہوتی تھی۔ وہ بڑے مہمان نواز تھے۔ اے ذیلدار پارک کے ایک حصے میں ادارہ ترجمان القرآن کا دفتر ہوتا تھا' جب بھی ان سے ملنے گیا' انہوں نے چائے یا مشروب خنک سے ضرور

تواضع فرمائی۔ وہ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا' ہاں البتہ کبھی کبھار وہ رنجیدہ اور غمزدہ ضرور دیکھے گئے۔ ادارہ ترجمان القرآن سے علیحدگی کے بعد بھی میں نے ان کو رنجیدہ دیکھا مگر وہ اتنے مرنجاں مرنج تھے کہ شکایت کرنے میں بھی ان کا انداز انتہائی محتاط تھا۔

مولانا چراغ دین صاحب جماعت کے بانی ارکان میں سے تھے۔ ان کا نام ہمارے ہاں فہرست ارکان میں مولانا مودودیؒ اور میاں طفیل محمد صاحب کے بعد لکھا ہوا ہے۔ فہرست ارکان میں ان کی تاریخ پیدائش درج نہیں ہے مگر انہوں نے اپنے ایک مکتوب بنام سید اسعد گیلانی مرحوم میں لکھا ہے کہ تاسیس جماعت کے وقت ان کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی پیدائش ۱۹۱۸ء میں ہوئی اور انہوں نے ۷۶ سال عمر پائی۔

سید اسعد گیلانی صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں تحقیق کر کے جماعت کے بانی ۷۵ ارکان کے نام معلوم کیے ہیں۔ ان ناموں میں سے کچھ تو روداروں میں موجود تھے۔ باقیوں کے لیے گیلانی صاحب مرحوم نے خاصی محنت اور جستجو کی۔ اس اہم تحقیق میں سب سے زیادہ حصہ مولانا چراغ دین مرحوم ہی کا ہے۔ انہوں نے ستائیس ۲۷ تاسیسی ارکان کے نام گیلانی صاحب کو مہیا کیے۔ یہ تعداد باقی سب تحقیقی معاونین سے زیادہ ہے یعنی کوئی بھی دوسرے بزرگ اتنے ناموں کی نشان دہی نہیں کر سکے۔

مولانا چراغ دین صاحب جب بھی ملتے بڑی محبت اور شفقت کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ ان سے آخری ملاقات سید اسعد گیلانی مرحوم کی وفات کے بعد منصورہ میں اجتماعی دعائے مغفرت اور قرآن خوانی کے موقع پر ہوئی۔ بڑے نڈھال اور کمزور نظر آرہے تھے اور گیلانی صاحب کی جدائی پر بڑے غمزدہ بھی تھے۔ اپنے بارے میں بھی فرما رہے تھے کہ بس چل چلاؤ ہے۔

مولانا چراغ دین صاحب بڑے فرض شناس تھے۔ اچھرہ میں مرکز جماعت کے جملہ رفقاء کو میں نے دیکھا تھا۔ بہت سے بزرگ اپنے گھروں سے بائی سائیکلوں پر دفتر آتے تھے۔ چراغ دین صاحب شروع شروع میں تو مرکز جماعت کے بالکل قریب رہائش پذیر تھے مگر بعد میں وہ مرکز سے دور چلے گئے تھے۔ اس دور میں وہ بھی سائیکل پر آتے تھے۔ وہ تمام رفقاء میں سب سے بھاری بھرکم تھے۔ سائیکل چلاتے ہوئے وہ عجیب سے لگتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ چوہدری رحمت الٰہی صاحب' ملک غلام علی صاحب' مولانا محمد سلطان صاحب اور چوہدری محمد اسلم سلیمی صاحب سبھی سائیکلوں پر آتے جاتے تھے۔

چراغ دین صاحب ترجمان کا ریکارڈ اور حساب کتاب بالکل اپ ٹو ڈیٹ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم جب بھی کسی چیز کے بارے میں استفسار فرماتے چراغ دین صاحب فوراً پوری معلومات مولانا کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ ادارہ ترجمان القرآن میں جب بھی جانے کا اتفاق ہوتا چراغ دین صاحب اپنے کام میں منہمک ملتے۔ ان کی وفات سے قبل لاہور جماعت کے امیر کے لیے استصواب اور مرکزی مجلس شوریٰ کی دو نشستوں کے لیے انتخاب کا مرحلہ در پیش تھا۔ مرحوم کے فرزند ضیاء الدین صاحب کے بقول انھوں نے اپنا پرچہ رائے دہی وفات سے ایک دن قبل پر کر کے انھیں دیدیا تھا کہ جماعت کے دفتر میں پہنچا آئیں۔ زندگی کے آخری لمحے تک وہ اپنے فرائض نہایت تندہی سے ادا کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

وہ لوگوں کے ذاتی معاملات میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ میں زمانہ طالب علمی میں ایک مرتبہ کیمپ جیل لاہور میں نظر بند تھا' مولانا چراغ دین مرحوم کئی مرتبہ ملاقات کے لیے جمعیت کے ساتھیوں کے ہمراہ جیل تشریف لائے۔

مولانا کے بیٹوں میں سے صلاح الدین میرے ہم عصر تھے۔ ان سے زمانہ طالب علمی میں اچھے دوستانہ مراسم رہے' مگر جب عملی زندگی میں داخل ہوئے تو رابطے منقطع ہو گئے۔ برادرم صلاح الدین اس دور میں مولانا چراغ دین صاحب کے برعکس بہت تیز مزاج' ہوشیار اور کثیر الکلام نوجوان تھے۔ بعض موضوعات پر گرماگرم بحثیں اور اختلاف رائے ہو جاتا تھا مگر صلاح الدین صاحب اختلاف رائے کا اظہار کرنے کے باوجود مسکراتے رہتے تھے۔ اب سنا ہے وہ دمام میں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں خوش و خرم رکھے۔

مولانا چراغ دین مرحوم کبھی کبھار جمعہ پڑھنے کے لیے منصورہ تشریف لے آتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھار منصورہ میں جمعہ پڑھاتا ہوں۔ نماز کے بعد وہ ضرور ملاقات کرتے اور بہت دعائیں دیتے۔ خطاب کی تعریف کرنے لگتے تو میں عرض کرتا کہ یہ آپ بزرگوں کی دعاؤں کا اثر اور فیضان نظر ہے۔ وہ اپنے مخصوص پیار بھرے سادہ لہجے میں فرمایا کرتے تھے "مجھے آپ سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے بچپن سے قرآن مجید کی نعمت میرے سینے میں محفوظ کر دی ہے۔ میں تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ گزشتہ کئی سالوں سے میرا مستقل معمول ہے کہ میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے تلاوت قرآن پاک میں مصروف رہتا ہوں۔ مولانا چراغ دین صاحب کے

جنازے کے لیے مرکز جماعت سے ہم لوگ چلے تو میں سورۂ یوسف کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب مولانا چراغ دین صاحب کا جنازہ اٹھا تو میں سورۂ ابراہیم میں پہنچ چکا تھا۔ آیت نمبر ۹ سے جو سلسلہ کلام شروع ہوتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ اور ان کے مخالفین کا ذکر کیا ہے۔ طاغوتی قوتوں نے انبیاءؑ کو ڈرایا دھمکایا مگر وہ اپنی بات پر ڈٹ گئے۔ اللہ کے بندے بھی انبیاء کرامؑ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر دور میں استقامت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ میں نے مولانا چراغ دین مرحوم کا پر سکون چہرہ دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ کا یہ بندہ بھی اس آیت کا مصداق ہے۔

اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری راہنمائی کی ہے؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔ (ابراہیم ۱۴: ۱۲)

مولانا چراغ دین صاحب اور جماعت کے ابتدائی لوگوں نے ہر مخالفِ حق قوت اور طاغوت کو للکارا اور مشکلات کے مقابلے میں اللہ کی توکل کے سہارے پر ڈٹ گئے۔ مولانا چراغ دین صاحب نے بہت مشکل وقت گزارا مگر نہ تو کبھی کسی سے شکوہ کیا نہ بد دل اور مایوس ہوئے۔

یہ سطور تو مولانا چراغ دین مرحوم کی یاد میں لکھی ہیں مگر بات سے بات نکل آتی ہے۔ جس روز مولانا چراغ دین صاحب کا جنازہ تھا اسی روز مرکزی اور صوبائی شوریٰ کے رکن شیخ محمد انور زبیری (وزیر آباد) کی والدہ مرحومہ کا جنازہ بھی تھا۔ میں مرحومہ کے جنازے میں پہنچا اور شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی والدہ بڑی عظیم خاتون تھیں۔ شیخ صاحب جب بھی کبھی گرفتار ہوتے' والدہ پریشان ہونے کی بجائے ان کا حوصلہ بڑھاتیں۔ شیخ صاحب اپنی والدہ مرحومہ کا تذکرہ کر رہے تھے اور میں اس وقت سورۂ قصص کی آیات پڑھ رہا تھا جن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کا تذکرہ کیا ہے۔

اسی طرح ہم موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے' مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ (قصص آیت ۲۸: ۱۳)

مولانا چراغ دین صاحب اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو مہر و وفا کا پیکر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس
ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

رسائل و مسائل

داڑھی کی شرعی حیثیت

سوال: محترم، درج ذیل مسائل میں علماء کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔
(۱) داڑھی رکھنا سنت ہے یا واجب (۲) داڑھی کی لمبائی قرآن و سنت، اجماع امت اور فقہ حنفی کی روشنی میں کتنی ہونی چاہیے۔ فقہا، مفسرین و محدثین نے چار انگل لمبائی ضروری لکھی ہے۔ مولانا حسین احمدؒ مدنی، مولانا عاشق الٰہیؒ، مولانا قاری محمد طیبؒ مولانا محمد زکریاؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور بھی کثرت کے ساتھ علماء نے فتویٰ یا رسالہ کی شکل میں لکھا ہے کہ چار انگل لمبائی داڑھی کی ضروری ہے۔ جو اس سے کم رکھتا ہو، کٹواتا یا منڈواتا ہو، وہ امامت کے قابل نہیں۔ اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز لوٹانا واجب ہے۔ داڑھی کٹوانا حرام ہے، اس لیے ارشاد فرمائیں کہ داڑھی کی لمبائی کی شرعی مقدار کیا ہے (۳) داڑھی کٹوانے والے کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں (۴) ٹھوڑی کے نیچے گلے والے بالوں کا خط بنوانا جائز ہے یا نہیں، ہے، تو کس حد تک۔ نیز عصرِ حاضر کے بعض ممالک کی ممتاز دینی شخصیات کی داڑھیاں نہیں تھیں، انہیں فاسق کہا جائے گا یا نہیں؟

جواب: داڑھی کی مقدار اور داڑھی کے بارے میں دیگر مسائل سے متعلق آپؐ کے استفسار کا جواب درج ذیل ہے۔

۱۔ داڑھی رکھنا واجب ہے اور اس کا وجوب قرآن پاک کے اشارات اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات سے ثابت ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "لا تبدیل لخلق اللہ" (اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہ کرو۔) نیز تغیر خلقت کو اغواء شیطانی قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ "لا مرنہم فلیغیرن خلق اللہ" (میں لوگوں کو اپنی فطری خلقت تبدیل کرنے کے لیے کہوں گا اور وہ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اللہ کی بنائی ہوئی شکل کو بگاڑیں گے۔) داڑھی مرد اور عورت کے درمیان امتیاز ہے اور اس کا مونڈنا اللہ

تعالٰی کی بنائی ہوئی شکل کو بگاڑتا ہے۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کے بارے میں جو ارشاد فرمایا ہے اسے مختلف الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔ بعض میں **"اعفوا اللحی"** (داڑھیوں کو زیادہ کرو' بڑھاؤ) بعض میں **"وفروا اللحی** (داڑھی کو پورا کرو' زیادہ کرو) اور بعض میں **"ارخوا اللحی"** کے الفاظ آئے ہیں' یعنی (داڑھیوں کو چھوڑ دو)۔ بڑھانے' زیادہ کرنے اور چھوڑ دینے کی مقدار کیا ہے؟ اس کا احادیثِ مرفوعہ میں ذکر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ بڑھانے کی اگر خاص مقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ہوتی تو آپؐ اسے بیان فرماتے۔ صحابہ کرامؓ اپنے اقوال میں اس کا ذکر کرتے۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑھانے کی کوئی خاص مقدار شرع میں مقصود نہیں ہے۔ بڑھانے کے تین مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اس طرح بڑھایا جائے کہ اسے قینچی تک نہ لگائی جائے۔ اور جس قدر بڑھے اسے بڑھنے دیا جائے۔ جمہور کے نزدیک یہ مرتبہ مراد نہیں ہے۔ لیکن بعض فقہا کے نزدیک مطلقاً بڑھانا واجب ہے' اور اسے کاٹنا جائز نہیں ہے۔ جن احادیث سے کاٹنا ثابت ہوتا ہے انہیں وہ ضعیف قرار دیتے ہیں۔ علماء سعودی عرب' شیخ عبدالعزیز بن باز وغیرہ کی یہی رائے ہے۔ ان سے سوال کیا گیا "داڑھی مونڈنے اور کاٹنے کا کیا حکم ہے" تو انہوں نے جواب دیا "داڑھی کا مونڈنا اور کاٹنا حرام ہے"۔ اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں ان کی تصریحات دونوں صورت کو شامل ہیں۔ **اعفوا اللحی' ارخوا اللحی' وفروا اللحی** وغیرہ کا مطلب یہ ہے کہ اسے بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے' نہ مونڈا جائے اور نہ کاٹا جائے۔ (فتویٰ نمبر ۲۷۳۶۔ جاری کردہ مورخہ ۲۔۱۳۔۱۳۹۹ھ)۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ ایک قبضہ تک نہ کاٹا جائے' قبضہ سے زائد کو کاٹا جائے۔ اس مرتبہ پر عمل بعض احادیث' آثار صحابہ و تابعین سے ثابت ہے۔

تیسرا مرتبہ بڑھانے کی اتنی مقدار جسے عرف میں بڑھانا کہا جائے' اور داڑھی اتنی بڑی ہو کہ عرف میں اسے بڑی داڑھی کہا جائے۔ اس مرتبہ پر حدیثِ مذکورہ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ پر تعامل کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ داڑھی کو قبضہ کی خاص مقدار تک بڑھانا فرض اور واجب نہ تھا' البتہ حدیث کے حکم "داڑھیوں کو بڑھاؤ" پر عمل کرنے کی مناسب اور موزوں ترین صورت یہی ہے۔ لہٰذا ایک قبضہ سے کچھ کم' جس پر "داڑھیوں کو بڑھاؤ" کا حکم صادق آتا ہو یعنی داڑھی بھاری ہو اور بڑھی ہوئی ہو' تو اس پر عمل کرنا بھی جائز شمار

ہو گا' اور اسے حدیث کے مذکورہ حکم کی خلاف ورزی بھی نہیں کہا جائے گا' نہ ہی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی شکل کو بگاڑنا سمجھا جائے گا۔ یہی بات بعض علماء سلف نے کہی' اور عصرِ حاضر کے بعض علماء کی بھی یہی رائے ہے۔

علامہ عینی فرماتے ہیں'

وقال اخرون یا خذ من طولھا و عرضھا مالم یفحش اخذہ ولم یجد وا فی ذالک حدا " غیر ان معنی ذالک عندی مالم یخرج من عرف الناس (ج ۲۲ ص ۴۷)

(بعض دوسرے علماء کے نزدیک طول و عرض سے کاٹنا جائز ہے جب تک بہت زیادہ نہ کاٹ لی جائے۔ اور انھوں نے کاٹنے کی کوئی حد مقرر نہیں کی لیکن میرے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اتنی کاٹی جائے کہ لوگوں کے عرف کے دائرہ سے نہ نکل جائے۔)

مفتی کفایت اللہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں'

جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں یا منڈی ہوئی کے مثل کتراتے ہیں' وہ فاسق کی تعریف میں شامل ہیں۔ لیکن جو لوگ داڑھی رکھے ہوئے ہیں لیکن ایک قبضے سے کچھ کم ہے' ان کو فاسق کہنے میں احتیاط کرنی چاہیے' کیونکہ ایک قبضہ کی حد قطعی نہیں ہے۔ (کفایت المفتی ص ۹۱ ۔ ج ۹ طبع ملتان)

مزید فرماتے ہیں'

یہ ظاہر ہے کہ **اعفوا اللحی** سے اعفاء یعنی داڑھی بڑھانے کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی یقینی ہے کہ اعفاء سے غیر محدود بڑھانا مراد نہیں ہے' کیونکہ یکمشت سے زیادہ کو کتروانا بالاتفاق جائز ہے۔ بلکہ طولِ فاحش کو بعض فقہا نے مکروہ اور خفتِ عقل کی دلیل بھی قرار دیا ہے۔ تو جب غیر محدود بڑھانا مراد نہیں ہے تو کس قدر بڑھانا لازم ہے' اس کے لیے تحدید صرف ایک قبضے والی روایت سے ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ ظنی ہے۔ یعنی اس مرتبے میں نہیں کہ اس کو تحدیدِ اعفاء کے لیے دلیل بتایا جائے۔ کیونکہ فعلی روایتیں ہیں جن کا مفاد یہ ہو سکتا ہے کہ ایک قبضے تک رکھ کر زیادہ کو کٹوانا ثابت ہے' لیکن ایک قبضہ فرض ہے یا مسنون یا مستحب' اس کا فیصلہ ان حدیثوں سے نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک قبضہ کی حد کو مسنون قرار دیا جائے' اور حلق یا قطع فاحش کو بوجہ مشابہت بالنساء یا مشابہت باعجم کے

مکروہ تحریمی کہا جائے' اور قطع یسیر غیر متمیز کو خلافِ سنت یا مکروہ تنزیہی قرار دیا جائے۔ (کفایت المفتی' ج ۹' ص ۱۶۴)

علامہ عینیؒ کے بیان کردہ مذاہب میں سے تیسرے مذہب اور حضرت مفتی صاحبؒ کی رائے میں اتنا فرق ہے کہ علامہ عینیؒ کے نقل کردہ تیسرے مسلک میں قطع یسیر غیر متمیز یا عرف کی حد تک بڑھی ہوئی داڑھی کو بھی "اعفوا اللحی" کا مصداق یعنی سنت قرار دیا گیا ہے۔ اور حضرت مفتی صاحبؒ رحمتہ اللہ علیہ اسے مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں۔ لیکن دلیل کے لحاظ سے راجح بات وہ ہے جسے علامہ عینیؒ نے نقل کیا ہے کیونکہ فعل قول کے لیے مخصص نہیں ہوا کرتا اس لیے قبضہ والی روایت سے قبضہ کی سنیت ثابت ہوتی ہے' لیکن اس سے کم مقدار کی سنیت کی نفی نہیں ہوتی' جب کہ اس پر کما حقہ "اعفوا اللحی" داڑھیوں کو بڑھانا صادق آتا ہو۔ لغت کے لحاظ سے اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک قبضہ تک بڑھی ہوئی' بڑی داڑھی شمار ہو اور قبضہ سے کم بڑھی ہوئی' بڑی داڑھی نہ قرار پائے۔ بلکہ خود مفتی کفایت اللہؒ اپنے ایک فتویٰ میں اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں'

اڑھی منڈانے والا یا اتنی کتروانے والا کہ جس پر داڑھی بڑھانے کا عرفاً اطلاق نہ ہو گنہ گار ہے کیونکہ وہ امر اعفوا اللحی کی خلاف ورزی کرنے والا ہے جو بالاتفاق وجوب کے لیے ہے (کفایت المفتی ج ۹ ص ۱۶۲)

رہی یہ بات کہ عصر حاضر کے بعض ممالک کے نہایت ہی مخلص مسلمان اور مجاہد شخصیات کی داڑھیاں نہیں تھیں' در آنحا لیکہ انھوں نے دین کی بڑی خدمت کی اور اس کے لیے گراں قدر اور قابل رشک قربانیاں بھی دیں' تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس علاقے میں کوئی حکم شرعی کمزور پڑ جائے اور عامتہ الناس اور خواص تک میں اس کے سلسلہ میں کمزوری پیدا ہو جائے' جس کے نتیجہ میں اس حکم کی طرف توجہ نہ رہے یا اس کا صحیح علم نہ حاصل ہو سکا ہو تو' ایسی صورت میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور اس حکم کے تارک پر فسق کا حکم نہیں لگایا جاتا۔ البتہ اگر کسی پر مسئلہ واضح ہو جائے اور اس کے بعد بھی وہ حکم شرعی کی خلاف ورزی کرے تو اسے فاسق کہا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ کہ کس شخص نے کس وجہ سے اس حکم کی خلاف ورزی کی' ہر شخص کی مجموعی زندگی اور اسلام کے ساتھ اخلاص اور وابستگی کی بنیاد پر ہو گا۔ جن لوگوں نے اقامتِ دین کی خاطر اپنی زندگیوں کو قربان کر لیا اور پھانسی تک کی سزا کو خوشی سے ہنستے ہوئے قبول کیا ان کے بارے میں اسی حُسنِ ظن سے کام لیا جائے گا کہ ان پر مسئلہ واضح نہ ہو

بقیہ بر صفحہ ۲،

مطبوعات

عنایات: پروفیسر عنایت علی خاں۔ ناشر: نت کھٹ پبلی کیشنز حیدر آباد (پاکستان) سفید کاغذ پر طباعت مناسب، سرورق دبیز چکنا رنگین، صفحات ۱۴۰، قیمت ۳۶ روپے۔

کلی کھلنے کو ہوتی ہے تو زمین اسے تیار شدہ بنا تاتی جو ہر دیتی ہے، سورج کی شعاعیں اس کے عروق میں سیالِ رواں کے لیے قوتِ محرکہ مہیا کرتی ہیں، نسیم سحرا سے تقسیم کا ہنر اور نزاکت کی ادائیں اور سبق سکھاتی ہے، شبنم پودے کے پتوں کو دھو دھو کر اس قابل بناتی ہے کہ وہ ہوا میں سانس لے سکیں اور اندر سے آکسیجن گیس خارج کر سکیں، اور یہ عمل پورے نظامِ ہضم کو جاری رکھتا ہے۔

پروفیسر عنایت علی خاں کے مجموعہ کلام کے ساتھ یہی ہوا۔ کلی کھلنے کو تھی، کہیں سے مصارف کا انتظام ہوا، کسی نے کتابت کی ذمہ داری سنبھالی، کہیں طباعت کا بندوبست ہوا، کسی نے سرورق پر مو قلم چلایا، اور اتنی "عنایات" کے نتیجے میں کلی کیا کھلی، گویا پورا گلستان ہی رونما ہو گیا۔ انسانی قدروں کے قسائیوں کے اس زمانے میں ایسے لوگ باقی ہیں جن کے دل کسی شعر کے برگ گل سے کٹ سکتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کی شاعری میں سنجیدہ عنصر اور مزاحیہ جزو، دونوں پائے جاتے ہیں۔ سنجیدہ کلام کی ایک مثال۔

مجھے تو نے جو بھی ہنر دیا، بہ کمالِ حسنِ عطا دیا
مرے دل کو حبِ رسولؐ دی، مرے لب کو ذوقِ نوا دیا
(حمد)

پوری نظم بڑی شاندار ہے۔

مزاحیہ کلام کی مثالیں ۔

اور اس دولھا کا قصہ آپ نے بھی تو سنا ہوگا اسے جب آر سی مصحف کی خاطر گھر میں بلوایا
کہ لڑکا اندر آئے اور دلہن دیکھ لے چرا تو دروازے پہ پہنچا اور یہ کہہ کر پلٹ آیا
ذرا یہ ورلڈ کپ ہولے' تو اس کے بعد دیکھیں گے
(ورلڈ کپ)

ماتحت افسروں کو مکھن لگا رہے ہیں مکھن لگا لگا کر الو بنا رہے ہیں
تعریف کر رہے ہیں' پانی چڑھا رہے ہیں افسر پھسل پھسل کر شیشے میں آ رہے ہیں
مکھن لگاؤ بھیا! مکھن سے کام ہوگا

بیوی اگر ہو خفا مکھن لگا کے دیکھو فرضی محاسن اس کے دو اک گنا کے دیکھو
دو ایک حاشیے پھر ان پر چڑھا کے دیکھو جھٹ مسکرا پڑے گی' تم آزما کے دیکھو
مکھن لگاؤ بھیا! مکھن سے کام ہوگا

کہا جو سیٹھ نے جھلا کے ایک سائل سے کہ اب تو کمال بھی اللہ کے نام دے دی ہے
تو گائے بولی یہ ڈکرا کے ڈپ فرزر سے مجھے تو تُو نے بقائے دوام دے دی ہے
(بقرعید)

"اندیشے" سے بھی لطف لیجئے:

کلمہ پڑھتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہیں اس کو خبر نہ ہو جائے
یعنی ایماں قبول دل سے ہمیں وہ "بش" آزردہ گر نہ ہو جائے
(اندیشے)

یہ چند اشعار اس مجموعہ کلام کی پوری لطافتوں اور دلچسپیوں کو سامنے نہیں لا سکتے۔ بہرحال ہماری رائے میں جہاں سنجیدہ کلام میں عنایت صاحب کا رنگ الگ سا نکھر رہا ہے' وہاں ان کے موضوعاتِ مزاح' موادِ مزاح اور طرزِ مزاح شاعری میں دوسروں سے مختلف طرز کا ہے۔ یعنی معاصرانہ نقالی کے عیب سے شاعر پاک ہے۔ (ن ۔ س)

باعثِ تحریر آنکہ: از پروفیسر افضل علوی ۔ ناشر: فاروق اعجاز (مطبع جسارت پرنٹرز۔ ۲۴ سرکلر روڈ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ اردو ڈائجسٹ ۲۴۔ سرکلر روڈ لاہور۔ صفحات ۲۰۰۔ سفید کاغذ مجلد مع رنگین گردپوش۔

پروفیسر افضل علوی صاحب کو ہمارے حلقۂ ترجمان القرآن کے اصحاب ضرور جانتے ہونگے۔ اب وہ ذرا نئے رنگ میں آئے ہیں' "باعثِ تحریر آنکہ" ان کی مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ایک مقام سے عام سا ایک اقتباس:

"خود ہم نے جب بوڑھا ہونے کا انتظار کیے بغیر صرف ۲۵ سال کے سن میں (یہ سال کا سن کیا ہوا۔ راقم) داڑھی رکھ لی تو یار لوگوں نے ہمیں راہ راست پر لانے کے لیے کوئی پاپڑ سے پاپڑ بیلے کہ ان کا تذکرہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے ـــــ ہمارے اس شرعی اقدام سے ہمارے گھر والے سہم گئے' اور ہمیں یوں لگا کہ جیسے ہم ان کے کسی کام کے نہیں رہے' تو ہم نے انہیں سمجھایا کہ آپ لوگ بے فکر رہیں' ہم نے داڑھی رکھی ہے' دنیا نہیں تیاگی' زندہ دلی نہیں چھوڑی (جی ہاں! جب کوئی زندہ دل داڑھی رکھ لیتا ہے تو وہ نیم چڑھا کریلا بن جاتا ہے' کیونکہ وہ ادبدا کر کچھ زیادہ ہی مضحکات کے فنی کرشمے دکھاتا ہے۔ راقم) انجمن آرائی ترک نہیں کی' کھانا پینا بند نہیں کیا' لہٰذا یہ تشویش اور پریشانی کیوں' جبکہ ہم وہی ہیں جو کہ تھے۔ کہا گیا "اور تو کوئی بات نہیں' بابا بننے کے لیے عمر پڑی تھی' ذرا کچھ دن اور فیشن ویشن کر لیا ہوتا۔" (ص ۱۳۶ ـــــ ۱۳۷)

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علوی صاحب کا مزاح پھکڑ قسم کا بھی نہیں اور پھوہڑ قسم کا بھی نہیں' بلکہ بہت شریفانہ اور پروفیسرانہ قسم کا ہے۔ یعنی ہلکا پھلکا مزاح' یا پیازی مزاح۔ کاش کہ ہم دوسرے مضامین کی جھلک دکھا سکتے۔ مثلاً: "در مدح خود" "یہ مزے مزے کے مغالطے" "شہر میں کھولی تھی علوی نے دکان سب سے الگ" "ڈاکٹر بھرم بھریالوی" وغیرہ۔

فلیپ پر مجید نظامی صاحب نے ان کی اسلام اور پاکستان سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کو اولین مزاحیہ مضمون "درمدح نعرہ" لے ڈوبا (یہ الفاظ میرے ہیں۔ راقم) پھر احباب نے اس مضمون کا پرچم اتنا بلند کیا اور اتنے غبارے اور کبوتر اس کے اعزاز میں چھوڑے کہ علوی صاحب تین چار ماہ میں پورے مجموعے کے مضامین لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ گویا ایک سرچشمہ اندر

بند پڑا تھا وہ یکدم کھلا اور امڈ پڑا۔ اب اگر آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہا تو سیلابِ مزاح کے چڑھ آنے کا اندیشہ ہے۔ مشتاق یوسفی اور کرنل محمد خاں جیسے حضرات توجہ کریں۔

مزاحیہ ادب کی صنف فی الحقیقت اصلاح کا بھی لطیف ذریعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے اہلِ صلاحیت کو کام میں لا کر اعلیٰ انسانی و روحانی اقدار کو لمعاں و تاباں کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم آنسوؤں اور خون کے سمندر میں تیرنے والوں سے اگر ماہرین قہقہے لگوالیں تو کونسا کمال ہوا اور حاصل کیا۔ ہنسنے ہنسانے کے بعد پھر وہی آنسو' وہی لہو' وہی لاشیں' وہی انسانیت آزاری' وہی ظلم!

بھئی سنجیدہ تحریر ہو یا مزاحیہ اس فضا کو بدلنے کی سعی کی ضرورت ہے۔ آج کل زمین کے مادی ماحول کی فکر میں اقوام عالم سرگرداں ہیں۔ کسی کو یہ بھی احساس ہے کہ ایمانی' اخلاقی اور روحانی آلودگیاں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ (ن ۔ ص)

آگ' خون اور کشمیر: مصنف: آغا اشرف۔ ناشر: جہانگیر بک ڈپو۔ اردو بازار لاہور۔ سفید کاغذ پر جدید مشینی طباعت۔ صفحات ۳۲۴' مضبوط جلد' جلد پر رنگین طباعت میں منظر کشمیر۔ قیمت ۹۰ روپے۔

میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ وہی آغا اشرف ہیں جن کو میں جانتا ہوں' جن کا مجھ سے ۷۹۔۱۹۷۸ء میں رابطہ ہوا۔ کتاب کے آئینے میں انہی کی تصویر دکھائی دیتی رہی۔ اور اگر کوئی دوسرے آغا اشرف ہیں تو فنی و ادبی لحاظ سے یہ بھی کم نہیں۔ اچھے کام کرنے والے لوگ سب اپنے ہی ہیں۔

یہ کتاب بعض جگہ محض بیانیہ بھی ہے' مگر غلبہ ناول کے سے انداز کو حاصل ہے۔ بلکہ اسے ناول ہی کہنا چاہیے۔ یہ ناول کہیں تو واقعاتی تاریخ کا عکس پیش کرتا ہے اور کہیں تاریخ کی تکمیل تھام لیتا ہے۔ یہ ایک جملہ روحِ معنویت کو بیان کرتا ہے: "مجاہدینِ کشمیر کے خون سے آزادی کا سورج طلوع ہونے والا ہے" (ابتدائیہ)۔

پہلا باب جبل پور اور ساگر کے واقعات سے شروع ہوتا ہے۔ اس باب میں برہمن مہاجن سامراج کے آلۂ کار بے شعور ہندوؤں نے جس طرح کے مظالم مسلمانوں پر ڈھائے' جس طرح سرکاری محکمہ ہائے قیامِ امن نے کارنامے دکھائے' جس طرح بات بگاڑ بگاڑ کر پروپیگنڈا کیا گیا۔ عورتوں سے زیور ہتھیائے گئے' مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ خوب کہا: "لاکھوں روپے کی جائیداد کی قیمت ایک دیا سلائی۔" پھر ایک دلچسپ کردار شام بابو کا ابھرتا ہے جس کے ذہن میں "کپکپاتے ہوئے شعلے چیختے رہے۔ چلاتے رہے!" (کپکپاتے ہوئے شعلے کیا معنی' اردو زبان میں

ایسی بات نہیں کی جا سکتی۔) یہ کردار بھنا کر کہتا ہے کہ "اقلیت کی ہزاروں مسلمان لڑکیوں کی عصمت کے خون کا قصاص کون لے گا—— کب لیا جائے گا۔" "ان کو جبراً بیویاں اور رنڈیاں بنانے کا یہ اخلاق سوز مشغلہ کب تک جاری رہے گا؟" اور پھر "متشدد ہندو تنظیموں کے ان راونوں اور راکششوں کو روندنے والا' ان کی وحشت و بربیت کی لنکا کو پھونکنے والا کوئی رام' کیا رام بھومی اجودھیا سے اب کبھی جنم نہ لے گا؟" ——اجودھیا کے رام! تم کہاں ہو؟

"وہ ایک بگولے کی طرح پیچ و خم کھاتے ہوئے پھر کمرے میں چلا آیا اور بستر پر گر کر سسکیاں لینے لگا۔"

دراصل آغا اشرف نے جو مختلف تاریخی ابواب کتاب میں جمع کیے ہیں ان میں سے اس پہلے باب کا مقصد یہ ہے کہ ہندو ذہنیت' ہندو مذہب' ہندو تہذیب اور ہندو کردار کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے جو اپنا آخری روپ کشمیر میں دکھاتا ہے۔ بیچ کے مختلف ابواب میں بھارتیوں کی مسلم کشی کے لیے شہر بہ شہر فسادات کا ذکر ہے۔

دوسرے باب میں بات اجنتا اور ایلورا سے چلتی ہے کہ "آدھی سے زیادہ ننگی نرتکی ناچ رہی ہے"۔ ہندوؤں کا بت پرستانہ اور جنس پرستانہ ثقافتی منظر دکھایا گیا ہے۔ یہاں جو الفاظ اور اصطلاحات استعمال کیے گئے ہیں اور جس طرح کی انسانی ذہنی پستیاں اور جسموں کے کرتب پیش کیے گئے ہیں' وہ ناول نگار کی مہارت کا ثبوت ہیں۔ ثقافتی پس منظر قدیم اور منظر جدید۔ دلچسپ امتزاج ہے۔ یہ باب بڑھتے بڑھتے ہمیں "موت کا لمبا سفر" طے کراتا ہے' تقسیم کے وقت کی انسانی خونخواری کا سرخ سین سامنے آجاتا ہے۔

ہر باب پر گفتگو کرنا مشکل اور اہم ادبی لطافتیں سامنے لانا مزید مشکل۔اور دل پر پتھر رکھ لینا اور بھی مشکل۔ مگر ہمارا راستہ مشکل ہے ہی۔ مختصر یہ کہ طرح طرح کے ثقافتی اور تفریحی مشغلوں کے اندر سے بھارت کے لیڈروں اور عامیوں کے ہر طرح کے کردار جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔

"وہ مسلمان تھا' یوسف تھا اس کا نام' وہ کشمیر کا باشندہ تھا۔" بس یہاں سے کشمیر کی داستان خونچکاں شروع ہوتی ہے۔ قصے کا پہلا دردناک دور تقسیم کے زمانے سے متعلق ہے۔ اور دوسرا حال سے۔ بہرحال یوسف مرکزی ہیرو بن جاتا ہے۔ اور جہاد کی کہانی کے لیے ہیروئن شاہینہ قرار پائی ہے۔

"کشمیر میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ انسان ابھی تک صلیب پر لٹک رہے ہیں" —— "اور صلیب سے ٹپکتے ہوئے لہو کی ہر بوند سے ایلی ایلی لما سبقتنی کی آوازیں بلند ہو کر پوری کائنات میں گونج

رہی ہیں۔"

"آپریشن ناکام رہا ---- فلائیٹ لیفٹیننٹ چل بسے۔"

"یہاں آکر ناول ختم ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ پوری کہانی کا خلاصہ، واقعات کے الٹ پھیر، حیرتناک حوادث، مصنف کے خوبصورت جملوں اور وسعتِ معلومات کو بیان کیا جا سکے۔"

مختصر یہ کہ یہ ایک اہم کتاب ہے۔ (ن - ص)

اذان اور دوسرے افسانے: چوہدری غلام جیلانی مرحوم۔ ناشر: عبدالحفیظ، البدر پبلی کیشنز۔ ۲۳ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ سفید کاغذ، طباعت کمپیوٹرزی، صفحات ۱۹۹۔ سرورق رنگین اور دبیز، قیمت ۴۵ روپے۔

میں جب مدیرِ چراغِ راہ تھا ---- نئے خطوط پر کام کرنے والا پہلا ادبی رسالہ ---- تو لکھنے والے کم تھے، کچھ تیاری کے مرحلے تھے، کچھ کو چراغ راہ اکسارہا تھا، اور چند اصحاب پہلے سے صاحب مقام تھے (چاہے شہرت نہ رکھتے ہوں)۔ انہی میں سے چوہدری غلام جیلانی تھے۔ یکایک یہ نمودار ہوئے اور مدیرِ چراغِ راہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے افسانے مہیا کرنے لگے۔ کچھ افسانوں کے ذریعے، کچھ دوستوں کے ذریعے اور کچھ خود جیلانی صاحب کے ذریعے جانا کہ ان کا مطالعہ بڑا وسیع ہے۔ خصوصیت سے وہ فرانسیسی ادب میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ لہٰذا جو کچھ لکھ کر وہ بھیجتے، دیکھ کر جی خوش ہو جاتا۔

یہ مجموعہ ان کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کوئی بھی چیز کچی اور پھسپھسی نوعیت کی نہیں۔ "اذان" چھوٹی سی کہانی ہے، وہ کیا ہی شاندار سبق دیتی ہے۔ ترقی پسندوں نے جب اپنے جھکڑ چلا رکھے تھے، جیلانی کا "اذان" لکھنا گویا اذان کہنا ہی تھا۔ کہانیوں میں مذہبی الفاظ یا عنوانات کا آنا رجعت پسندی کی دلیل قرار دے کر ہر لکھنے والے پر وہ لوگ ایک ٹھپہ لگا دیتے تھے۔ ہم بہت سے ساتھیوں کے ناموں پر انہوں نے رجعت پسندی کے ٹھپے لگا رکھے تھے۔ خدا کے بندوں کی متعصبانہ ذہنیت میں اتنی ذرا سی دراڑ بھی نہ تھی کہ وہ کسی اچھے ادبی افسانے یا پرکشش شاعری کے متعلق یہی کہہ دیتے کہ فنی لحاظ سے خوب، مگر ہمارے فلسفہ کے لحاظ سے مسترد۔ افسوس ہے کہ ایسے تھڑدلے لوگ ہمارے ہاں بڑے انسان سمجھے جاتے ہیں۔ "تحریک" کا ماحصل واقعی یہی ہے کہ "تم عورت کو نہیں سمجھتے۔" "آدھی موت" بڑا اچھوتا خیال ہے اور ایک جتلائے مصیبت کو ماں کی ممتا بچالیتی ہے جو دو ڈھلکتے آنسوؤں میں جلوہ گر ہے۔

"موت کب آتی ہے" کا تجزیہ خاصا تفصیل طلب ہے۔ مگر میں مختصرا" یہ کہوں گا کہ جیلانی نے یہاں بھی موت' موت کا قانون اور موت کا فرشتہ پیش کرکے اور گناہوں کی گٹھڑی اور آخرت کا تصور دلا کر نظریۂ اسلامی کی جو خدمت کی ہے وہ تو ہے ہی قابل قدر۔ اس بیان سے فن کہیں زخمی نہیں ہوا۔ لیکن اس نے واقعاتی تجزیہ کاری میں اس سماج کے مروج احوال اور غیرتوں اور عزتوں اور انتقام کے مسائل کو ہمارے سامنے واضح کیا ہے۔ اور موت کا قانون یہ بتا دیا ہے کہ:

> انسان کو زندگی اس وقت تک عطا ہوتی ہے جب تک کہ وہ اپنے لیے اور نوعِ انسانی کے لیے مفید ثابت ہو۔ جب اس کی افادیت ختم ہو جائے۔ اسی وقت اس کی موت آجاتی ہے۔

قرآن نے یہی بات کہی کہ وَاَمَّا مَا یَنفَعُ النَّاسَ فَیَمکُثُ فِی الاَرضِ۔

"درونِ سینہ و بیرون وے" کا کردار علوم و فنون کی دلچسپیوں میں یکے بعد دیگرے کھو جاتا' مگر پھر بے اطمینانی اسے کسی اور طرف لے جاتی ہے۔ اور آخر وہ مناکحت کی منزل پر پہنچ کر پکار اٹھتا ہے کہ "ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر ناکمل ہے۔" پھر "چور" کا قصہ ہے جو اللہ ھو کی پناہ گاہ میں جا کر پہنچتا ہے' اور ہمیشہ کے لیے اس کا راستہ درست ہو جاتا ہے۔

"احوبہ" کے تو کیا کہنے۔ مختصر قدیم روایت کے مطابق منجم دو نئے چمکتے ستاروں کے قرب کو دیکھ کر بار بار توجہ کرتا ہے۔ احوبہ جو ایک یہودی رقاصہ کی بیٹی تھی' پوچھتی ہے' کچھ مجھ کو بھی بتا۔ منجم نے کہا: "یہ دو ستارے مل کر ایک شعلہ پیدا کرنے والے ہیں جو جہانِ قدیم و فرسودہ کو خاکستر کرکے ایک نئے جہان کو روشن کرے گا" --- "بیت المقدس کا نور فاران کی جانب ڈھلک رہا ہے۔"

اسکی پوری تشریح کو جاننے کے بعد خاص علامات معلوم کرکے احوبہ مکے کے باہر ایک شاندار قیام گاہ شامیانوں اور خیموں اور قالینوں اور تکیوں' نیز خوشبوؤں اور بہترین مشروبات سے آراستہ کرکے بیٹھ گئی۔ منصوبہ یہ تھا کہ حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ کے ازدواجی ربط کے درمیان ایک خاص مقررہ رات کو وہ حائل ہو جائے۔ یعنی سردارِ مکہ عبداللہ کو ورغلا بہکا کر ایک شب اپنے ہاں روک رکھے۔ مگر تقدیر کا جو منشا تھا وہ پورا ہوا اور احوبہ ناکام ہو کر غائب ہو گئی۔ اس افسانے میں روایتی حالات قدیمہ کی سج دھج' الفاظ اور جملے بہت خوبصورت ہیں۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے اور بہت پرلطف۔ اسے تاریخی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ عرفی معنوں میں اپنا رنگ

تاریخی کہانیوں جیسا نہیں رکھتا۔

"دیواروں کے پیچھے" نامی افسانہ جب پہلے پہل سامنے آیا تھا' اس وقت سے اب تک اس کا تاثر باقی ہے۔ ایک تو یہ حقیقت کہ ہمارے ہاں کی گھریلو معاشرت کی بہت اچھی تصویر ہے۔ فضا وساتی ہے۔ لڑکی سسرال جا کر جن دقتوں سے دوچار ہوتی ہے وہ بھی بیان ہوتی ہیں اور سلیمہ نے ان حالات میں جن قربانیوں اور دانشمندیوں کے ذریعے کامیابی کا راستہ بنایا' وہ بہت ضروری سبق ہے جو ہر لڑکی کو پڑھنا چاہیے۔

"۱۹۴۷ء میں میرے گاؤں کے چند مناظر" وہی تصویر پیش کرتے ہیں جو عمومی طور پر حالات کی تھی۔ اور آخر میں سخت مراحل سے گزرنے کے بعد بستر مرض پر سلیمہ یہ جملہ اپنے شوہر سے کہتی ہے "کہ خدا کو مانے بغیر ہمارا کوئی بھی عمل صحیح نہیں ہو سکتا۔" فضل کریم بھی خاصا مشہور ہوا تھا۔

الختصر جیلانی بی اے نے ثابت کر دکھایا کہ خدا پرستی کا نقطہ نظر یا اسلامی اقدار کو ساتھ لے کر بلکہ ان کو بنیاد بنا کر بھی ایسے افسانے لکھے جا سکتے ہیں جو فنی لحاظ سے درجہ اول کے ہوں' یا کچھ درجہ دوم کے۔ ان کے ہاں درجہ سوم نہیں پایا جاتا۔　　(ن - ص)

بقیہ: قرآن کیوں پڑھیں؟

تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟" (آیت - ۱۲)

۳۔ "لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" (آیت - ۱۳)

یہ زریں اقوال انسان سازی کے بہترین اصول ہیں اور ایک عمدہ ضابطہ حیات کے وہ نکات ہیں جن کی روشنی میں ایک صالح سماج کی تشکیل ہوتی ہے اور ہر قسم کی صلاح و فلاح کے راستے کھلتے ہیں۔ عزت نفس' شخصی شرافت' باہمی اعتماد و احترام اور صبر و تحمل جیسے اعلیٰ اوصاف پیدا کرنے کے لیے ان اقوال سے بہتر ہدایات ممکن نہیں ہیں۔ جو شخص قرآن پڑھے گا اور اس قسم کی بے شمار آیات پر غور کرے گا اس کے ذہن و کردار کی بہترین تعمیر متوقع ہے۔　　(جاری ہے)

REGD NO L 5340 PHONE 234014 236665
MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE.

ترجمۂ قرآنِ مجید

مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں

تفہیم القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ● صفحات: ۱۵۸۴ ● ہدیہ: ۱۷۵/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور